

UNIVERSAL
LIBRARY

OU_222041

UNIVERSAL
LIBRARY

COPY— 394—79-4-72—10,000.

(2)

OSMANIA UNIVERSITY LIBRARY

Call No. 27.1.1

Accession No. 10000

Author

Title

This book should be returned on or before the date last marked below.

غدر دہلی کے افسانوں کا

گیارہواں حصہ

دہلی کی

آخری شمع

از جناب میرزا فرحت اللہ بیگ صاحب دہلی

حضرت خواجہ حسن نظامی دہلی نے

مُصَنَّف کی اجازت سے شائع کیا

اور

ابن عربی کارکن حلقہ مشائخ دہلی نے بہ ماہ مئی ۱۹۲۸ء

پہلی بار ریاست برقی پریس دہلی میں چھپوایا

قیمت علم

طبع اول

غدر دہلی

غدر دہلی کے افسانوں کا پہلا حصہ | یہ وہ مشہور کتاب ہے جس کو خواجہ صاحب کی تصنیفاً
میں ماسٹر فرس یا اعلیٰ درجہ کی تصنیف کہا جاتا ہے ایک سو تتر
صفحہ کی کتاب ہے۔ لکھائی صاف ہے۔ کاغذ اچھیلی اعلیٰ

بیمات کے آنسو

درجہ کی۔ ٹائٹل مینی سرورق نہایت خوبصورت اور نگین ہے یعنی کئی رنگ میں چھاپا گیا ہے وہ فوج
چکی ہے۔ تازہ ایڈیشن میں نئے افسانے بڑے گئے ہیں۔ قیمت (یکرو پیہ آٹھ آنہ) (۱/۸) :-

غدر دہلی کے افسانوں کا دوسرا حصہ | جس میں انگریز مردوں، عورتوں اور بچوں کی ان مصیبتوں کا حال
ہے جو ان کو غدر ۱۸۵۷ء میں پیش آئیں۔ صفحات ۱۶۴ صفحہ۔

انگریزوں کی پٹیا

لکھائی۔ چھپائی نہایت اعلیٰ۔ کاغذ بہت دینر اور عمدہ۔ تین دفعہ
چھپی ہے۔ اس میں ۱۲ افسانے ہیں۔ یعنی تیرہ انگریز مرد اور عورتوں نے اپنی کیفیت خود لکھی
ہے بہت دردناک اور مؤثر ہے از حضرت خواجہ صاحب۔ قیمت آٹھ آنہ (۱/۸) :-

غدر دہلی کے افسانوں کا تیسرا حصہ | اس میں ان خطوط کا ترجمہ شامل ہے جو انگریزی فوج کے
افسروں نے دہلی کے محاصرہ کے وقت پنجاب کے انگریز افسروں کو
بھیجے تھے۔ ان خطوط میں بعض نہایت دلچسپ اور مخفی اور کئی

محاصرہ دہلی کے خطوط

مراسلات بھی ہیں۔ صفحات ۳۴ صفحہ۔ لکھائی چھپائی اور کاغذ سب اچھا۔ کل تیرہ مراسلے اس
کے ہیں۔ از حضرت خواجہ صاحب قیمت چار آنے (۱/۴) :-

غدر دہلی کے افسانوں کا چوتھا حصہ | یہ دوسرا اسی صفحہ کی کتاب ہے۔ لکھائی چھپائی بہت اچھی

بہادر شاہ کا مقدمہ

اور کاغذ بھی اچھا ہے۔ یہ غدر دہلی کے حالات میں نہایت
دردناک کتاب ہے۔ اس میں اُس مشہور مقدمہ کا حال ہے

دہلی کے افسانوں کی

گیارہواں حصہ

دہلی کی آخری شمع



حسن نظامی کا دنیا کا

سدار ہے نام اللہ رکا۔ دنیا کے طلسم خانہ میں کون رہا ہے جو دلی کی شان
رہ جاتی۔ اور کون جانتا ہے کہ دلی اُجڑنے کے بعد لندن کی آبادی منور ہوئی تو
یہ آبادی کب تک قائم رہیگی۔ اور کون انگریز حسن نظامی کی طرح ٹیمز دریا کے کنارہ
بیٹھ کر لندن کی ختم شدہ شان کے افسانے لکھا کرے گا۔

میں نے دہلی کی بربادیاں دیکھیں، آبادیاں دیکھنے کا وقت نہ ملا کہ مسیروں
پیدائش سے برسوں پہلے ان کا خاتمہ ہو چکا تھا۔ میرے ماں باپ نے اور نانا نانی
نے بادشاہ اور ان کے خاندان کو اپنے گھر میں آتے جاتے دیکھا اور قلعہ میں معائنہ کمر
مغلوں کی آخری بار کی سیر کی تھی۔ اور پھر انہوں نے ان سب کا گلوٹنا اور کھجڑنا
اور در بدر خاک بسر بننا بھی دیکھا تھا۔ میں نے ہوش سنبھالا تو رات دن بھی غمگین
کرتے والی کہانیاں سنیں۔ اور دل پر ان کہانیوں نے ایسے نقش کیے کہ آج اکیسواں سال

کی عمر میں بھی وہ باتیں کانوں میں گونجنا کرتی ہیں۔

لکھنے کا زمانہ آیا تو دل کے اثرات نے سب سے زیادہ دہلی اور غدر ۱۹۴۷ء کے حالات پر متوجہ رکھا۔ پہلا مضمون بہادر شاہ کے خاندان کی نسبت چھپا تو ملک میں دھوم مچ گئی۔ میں سمجھا یہ میدان لکھنے کے لیے ایسا ہی عمدہ ہے جیسا شاعری کے لیے تصوف سب سے اچھا میدان ہے۔

پھر تو ایک کتاب شائع ہو گئی۔ اور لوگوں نے انگلیز سرکار کو اس کے خلاف بدگمان بھی کرنا چاہا مگر سرکار نیت کو دیکھتی تھی کہ میں عبرت کی تاریخ لکھتا ہوں۔ انقلاب کے مقصد سے میر کچھ بھی تعلق نہیں ہے۔

پھر اس سلسلہ کا دوسرا تیسرا یہاں تک کہ دسواں حصہ بھی شائع ہو گیا اب میں نے خیال کیا کہ نِزاکِ عشق کا حلقہ۔ اس کے بعد کچھ باقی نہیں ہے جسکو لکھوں۔ ہاں شاہی خاندان کے کسی فرد کا کوئی قصہ مل جاتا تو اس کو نمک مرچ لگا کر کسی رسالہ میں چھپوا دیتا تھا۔

یہ ایک جناب میرزا فرحت اللہ بیگ صاحب دہلوی رجسٹر اربائی کورٹ حیدر آباد کا ایک مضمون دہلی کے ایک مشاعرہ کی نسبت نظر آیا جو رسالہ اردو اور رسالہ الناظر اور کتاب مضامین فرحت میں شائع ہوا تھا۔

وہ مضمون میرے دوست ملا واحدی صاحب ایڈیٹر رسالہ نظام المشائخ دہلی نے سب سے پہلے دیکھا اور چونکہ ان کا خاندان شاہجہاں بادشاہ کے زمانہ سے دہلی میں ہے، اور اس کے تعلقات قلعہ سے ہمیشہ رہے تھے اس لیے ان پر دہلی کے اس مشاعرہ نے بڑا اثر کیا۔ اور میں نے ان کے کہنے سے تمام و کمال مضمون پڑھا۔ حالانکہ میں آج کل کام کی کثرت کے سبب اکثر مضامین کے مطالعہ سے محروم رہتا ہوں۔

جب میں نے اسکو پڑھا تو فوراً انگریزی اخبار ننگ مسلم دہلی کے ایڈیٹر صاحب سے کہا کہ اس مضمون کا ترجمہ کیجئے تاکہ یورپ و امریکہ کو بھی دہلی کی آخری شمع کی روشنی نظر آ سکے۔

اس کے بعد میں نے میرزا فرحت صاحب کو اپنے عزیز دوست مولوی مظہر نظامی کے ذریعہ خط لکھا کہ وہ مجھ کو یہ مضمون بصورت کتاب شائع کرنے کی اجازت دیں میرزا صاحب نے جواب دیا اور ایسا جواب جس سے مجھے بہت خوشی ہوئی کہ وہ میری خواہش کے قدر دان ہیں۔ ان کی اجازت حاصل ہوتے ہی میں نے اس مضمون کا نام ”دہلی کی آخری شمع“ مشاعرہ کی رعایت سے رکھ دیا اور چھپوانے کی تیاری ہونے لگی۔ دہلی کے مصوروں کو تلاش کیا کہ ان میں کوئی ایسا نکلے جو میرزا فرحت کے لفظی مرقعوں سے تصویریں بنا سکے۔ میں ان کو کتاب میں درج کردوں۔ مگر اب تک مجھے اس میں کامیابی نہیں ہوئی۔

خدا کا نام لیکر کتاب کا تب کو دیتا ہوں۔ تصویریں مل جائیں گی یا بن جائیں گی تو ان کو بھی شریک کر دوں گا ورنہ میرزا فرحت نے مصوری میں کوئی کسر باقی نہیں چھوڑی ہے۔ صورتیں دکھانے، لباس بتانے، اور بول چال، رنگ و ڈھنگ کی نقل اتارنے میں کمال کر دیا ہے، مصور سے یہ بات نہ ہو سکتی جو الفاظ کی تصویروں نے اس مضمون میں پیدا کر دی ہے۔

میں چاہتا تھا کہ اس مضمون پر ایسا دیباچہ لکھوں کہ اس کی ہر خوبی پڑھنے والے کے ذہن میں آجائے مگر ایک مہینہ سے غم و اہم کے پیڑ کے نیچے دبا پڑا ہوں۔ ستمبر ۱۹۲۸ء کی شام کو مجھ پر کسی ظالم نے پستول چلا دیا اور جیگر گرنے لیا۔ میں چہرہ اور سینہ اسکے سامنے تھا اور وہ نشانہ باندھ کر فیر کر رہا تھا مگر کبھت گویاں نشانہ باز کی حریت بھٹیں، ایک گولی نے بھی قاتل کا ساتھ نہ دیا اور کوئی گولی میرے نہ لگی، البتہ میرے

بوڑے خسر پیرزادہ ستید محمد صادق کا وقت پورا ہو چکا تھا۔ ان کے گولی لگی اور وہ پلٹ گھنٹہ خاک و خون میں لوٹ لوٹ کر ختم ہو گئے۔

آج فروری ۱۹۲۸ء کی ۲۹ تاریخ ہے۔ گویا پورا ایک مہینہ ہو گیا۔ لیکن خواجہ بانو کا عزم پلٹ گھڑی کی طرح تازہ ہے، ان کے تو وہ باپ تھے۔ اور میرے بچوں کے نانا تھے۔ مگر میرے گھر کا بیان ہے کہ وہ اس کے بھی باپ تھے۔ اور میرا دل کہتا ہے کہ وہ میرے ماموں زاد بھائی بھی تھے، اور میرے بچپن سے آج تک سر پرست بھی تھے اور اب بارہ تیرہ سال سے خسر بھی تھے۔

جنگل میں اکیلا گھر، دشمنوں کی قتل کے بعد بھی رات دن کی دھکیاں، پولس کے عجیب و غریب حالات، دماغ قابو میں نہیں ہے اور دل تو شہید کے ساتھ ہی فنا ہو گیا تھا۔

ایسی حالت میں کیا دیا باج لکھوں اور کہاں سے وہ جذبہ لاؤں جو میرزا فرحت کے کمالات کی ترجمانی کر سکے۔

آخری بات یہ ہے کہ چوٹ کھایا ہوا دل خود ہی سمجھ لے گا کہ میرزا فرحت نے دہلی کی اس شمع کی زیارت کرا دی ہے جو مسلمانوں کی گزشتہ رات کو محفل کی رونق بڑھا رہی تھی اور مرنے والی قوم کی مٹنے والی تہذیب کو دکھا رہی تھی، اور جس نے صبح کے قریب روتے روتے ہچکیاں لیتے لیتے ایک آہ کی تھی اور ایک آہ کے ساتھ اس کا شعلہ بجھ کر اور دھواں نکلا ڈگیا تھا۔

میں ہلی شہر کے اندر اس کتاب کو شائع کر رہی ہوں وہی دہلی جس کے مشاعرہ کا اس کتاب میں بیان ہے۔ مگر نہیں یہ تو خواب کا بیان ہے، وہ دہلی اب کہاں؟ جسکی گردش شمع کا یہ افسانہ ہے۔ اب تو نہ کوئی شمع باقی ہے نہ کوئی پروانہ ہے۔

حسکُنِ نِظَاہِی - دہلی - ۲۹ فروری ۱۹۲۸ء

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

۱۲۶۱ ہجری میں دہلی کا ایک مشاعرہ

(۱)
تمہید

نام نیک نے تنکاں ضایع مکن تا بہمان نام نیکت برقرار
بقول غالب مرحوم انسان ایک محشر خیال ہے۔ لیکن خیال میں حشر
پا ہونے کے لیے کسی بیرونی تحریک کا ہونا لازمی ہے۔ دماغ خیال کا گنجینہ ہے لیکن
اس گنجینے کے کھلنے کے واسطے کسی ظاہری اسباب کی کنجی کی ضرورت ہے۔ مجھے
بچپن سے شعراء اُردو کے حالات پڑھنے اور سننے کا شوق رہا ہے، مگر کبھی کوئی
ایسی تحریک نہیں ہوئی جو ان کے حالات کو ایک جگہ جمع کرنے کا خیال پیدا کرتی،
اور یہ خیالات الفاظ کی شکل میں ظاہر ہو کر ایک خوش نما جلتی پھرتی تصویر
بن جاتے۔

جب کوئی بات ہونے والی ہوتی ہے تو اسباب خود بخود پیدا ہو جاتے
ہیں۔ اتفاق دیکھئے کہ پڑائے قدیم کاغذات میں مجھ کو حکیم مومن خاں مومن دہلوی
کی ایک قلمی تصویر ملی، تصویر کا ملنا تھا کہ یہ خیال پیدا ہوا کہ تو بھی محمد حسین آزاد
مرحوم کے ”نیرنگ خیال“ کی محفل شعراء کی طرح ایک مشاعرہ قائم کرے، مگر ان لوگوں
کے کلام پر تنقید کرنے کی بجائے صرف ان کی جلتی پھرتی تصویریں دکھا۔ خیال میں فتنہ

رفتہ بچنگی ہوئی اور اس نچلی خیال نے ایک مشاعرے کا خاکہ پیش نظر کر دیا۔ لیکن یہ سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ مختلف زمانوں کے شاعروں کو کس طرح ایک جگہ جمع کر دیں اس عقدے کو امیر اللہ تسلیم مرحوم کے اس شعر نے حل کر دیا

جوانی سے زیادہ وقت پیری خوش ہوتا، بھڑکتا ہے چراغ صبح جب خاموش ہوتا،
اس شعر کا دل میں آتا تھا کہ شعرائے دہلی کا آخری دور آنکھوں کے سامنے پھر گیا۔ اور دل میں یہ بات جم گئی کہ بجائے تمام شعرائے اردو کے، دہلی کے آخری دور کا نقشہ کھینچا جائے۔ قاعدے کی بات ہے کہ مرنے سے پہلے بیمار سنبھالا لیتا ہے۔ اردو شاعری کے حق میں بہادر شاہ ثانی کا زمانہ بھی دہلی کا سنبھالا تھا، بادشاہت برائے نام تھی اور جو تنخواہ بادشاہ سلامت کو ملتی تھی انہیں قلعہ کا خرچ بھی شکل سے چلتا تھا۔ بر خلاف اسکے دکن اور اودھ میں دولت کی گنگا بہہ رہی تھی۔ پھر بھی ”دریائے جہنم کی چکی ملی ریت“ دہلی والوں کے لیے نظر فریب رہی اور اُس ”اُجڑے دیا“ میں شعرا ہی نہیں ہر فن کے کاملوں کا ایک ایسا مجمع ہو گیا جسکی نظیر ہندوستان تو ہندوستان دوسرے کسی ملک میں بھی ملنی دشوار ہے۔

زمانہ ایک رنگ پر نہیں رہتا۔ ۱۸۵۷ء سے قبل ہی ان کا ملین فن میں سے بہت سے تو ملک عدم کو سدھا لے، جو بچے کھڑے رہ گئے تھے ان کو غدر کے طوفان نے تتر بتر کر دیا، جسکو جہاں کچھ سہارا ملا، وہیں کاہور ہا۔ دہلی برباد ہو کر حیدر آباد اور رامپور آباد ہوئے۔ اکثر شرفا گھروں سے ایسے نکلے کہ پھر اُن کو دہلی کی صورت دیکھنی نصیب نہ ہوئی۔ جو رہ گئے ہیں وہ چلنے چلائے کو تیار بیٹھے ہیں، بہت سے اُٹھ گئے، بہت سے اُٹھتے جاتے ہیں۔ اور ایک زمانہ وہ آنے والا ہے، کہ کوئی یہ بتانے والا بھی نہ رہے گا کہ مومن مرحوم کا مکان کہاں تھا، جس طرح سوائے میرے اب شاید کسی کو یہ بھی معلوم کہ اُن کی قبر کہاں ہے۔

ان چراغ ہائے سحری کو دیکھ دیکھ کر مجھے خیال آیا اس خیال کی محرک مومن مرحوم کی تصویر بھی ہوئی، کہ ”اُردو“ کے لیے ان سے ایک ایسا تو چراغ روشن کر لوں جسکی روشنی میں آنے والی نسلیں زبان اُردو کے اُن محسنوں کی شکلیں دخواہ وہ دُھندلی ہی کیوں نہ سہی، دیکھ سکیں اور اُن کا کلام پڑھتے وقت کم سے کم اُن کی صورتوں کا ایک موہوم سانچہ پڑھنے والوں کی آنکھوں کے سامنے پھر جائے۔ جو لوگ علمی مذاق رکھتے ہیں وہ جانتے اور سمجھتے ہیں کہ کسی کا کلام پڑھتے وقت اگر اس کی شکل و صورت، حرکات و سکنات، آواز کی کیفیت، نشست و برخاست کے طریقے، طبیعت کا رنگ اور سب سے زیادہ یہ کہ اُس کے لباس اور وضع قطع کا خیال دل میں رہے تو اُس کا کلام ایک خاص اثر پیدا کر دیتا ہے اور پڑھنے کا لطف دو بالا ہو جاتا ہے۔ ورنہ مصنف کے حالات سے واقف ہوئے بغیر اسکی کسی کتاب کا پڑھ لینا اگر موفوں کے ریکارڈ سننے سے زیادہ مؤثر نہیں ہوتا۔ یہی وجہ ہے کہ آج کل مہذب ممالک کے کسی مصنف کی کوئی کتاب شائع نہیں ہوتی جسکے شروع میں اُس کے حالات درج نہ کیئے جائیں اور وہ واقعات نہ دکھائے جائیں جن کی موجودگی میں تصنیف ضبط تحریر میں آئی۔

یہی خیالات تھے جنہوں نے مجھے ان چند اوراق کے لکھنے پر آمادہ کیا۔ اس البم میں آپ ایسی بہت سی تصویریں دیکھیں گے جو اُن کا ملین فن نے اپنے ہاتھ سے خود کھینچی ہیں، بہت سے ایسے مرتعے پائینگے جو دوسرے مصوروں کے ہاتھ کے بنے ہوئے ہیں، بعض ایسے نقش و نگار ملیں گے جو فوٹو یا قلمی تصاویر دیکھ کر الفاظ میں اُتائے گئے ہیں، اکثر و بیشتر ایسی صورتیں ہوں گی جو خود میں نے بڑے بوڑھوں سے پوچھ کر بنائی ہیں، لیکن ہر صورت میں شہادت تائیدی کے

مقابلے میں شہادت تردیدی کو زیادہ وقعت دی ہے۔ یعنی اگر کسی واقعے کے متعلق ایک بھی مخالف بات معلوم ہوئی تو اُس واقعے کو قطعاً ترک کر دیا۔

اگر اتنے سارے علیمے ایک جگہ ہی جمع ہو جاتے تو یقیناً یہ مضمون فوج کے چہروں کا رجسٹر بنکر بے لطف ہو جاتا، لیکن ردِ صحر تو آزاد مرحوم کے نیرنگ خیال نے دل میں مشاعرہ کا خیال ڈالا۔ ادھر کریم الدین مغفور کی کتاب طبقات الشعراء ہند کے طبقہ چہارم نے رجب سال ۱۱۰۰ ہجری کے ایک مشاعرے کا پتہ دیا۔ اب کیا تھا و نون کو ملا کر ایک مضمون پیدا کر لیا۔ یہی رنگ آمیزی اسکی تکمیل میں خود کر دیتا ہوں۔ البتہ اچھے بُرے کی ذمہ داری نہیں لیتا۔

بحیثیت مورخ سال ۱۱۰۰ ہجری کے واقعات میں خود اس طرح لکھ سکتا تھا

گو یا یہ سب میرے چشم دید ہیں اور

بچھو سپہرہ بار بار و پیدہ ام

پرنظر رکھتے ہوئے اس زمانہ کا بھی "مرزا صاحب" بن سکتا تھا۔ مگر میرے دل نے گوارا نہیں کیا کہ کریم الدین مرحوم کی کامیابی کا سہرا اپنے سر پہ باندھوں اور ایسے شخص کو دو دودھ کی مکھی کی طرح نکال کر پھینک دوں جس نے اس مشاعرے میں بہت بڑا حصہ لیا تھا، جس کے مکالم پر یہ مشاعرہ ہوا تھا اور جو اس مشاعرے کی روح رواں تھا۔ یہ ضرور ہے کہ ان کی مجلسِ محد و دہتی اور میں نے اسکو اتنی وسعت دی ہے کہ اُس زمانہ کے تقریباً سب بڑے بڑے شعراء کو اس میں لاجٹھایا ہے۔ اب اس میں مجھے کامیابی ہوئی یا نہیں اس کا اندازہ قارئین کرام فرما سکتے ہیں۔ اگر ہوئی ہے تو زہے نصیب میری محنت ٹھکانے لگی۔ اگر نہیں ہوئی تو گم سے کم یہی سمجھ کر میری زادِ دیجائے کہ "مرزا صاحب نے بات تو اچھی پیدا کی تھی مگر نباہ نہ سکے، جو ان سے نہیں ہوا وہ اب ہم کر دکھاتے

ہیں۔ ممکن ہے کہ اس طرح کوئی قلم کا دھنی ان "خفگان خاک" کا ایک ایسا مرقع تیار کر دے جو بزم ادب اُردو میں سجانے کے قابل ہو۔

لیجئے "میں" اب "مولوی کریم الدین صاحب" کی جون میں حاضر خدمت ہوتا ہوں، لیکن یہ ضرور عرض کیے دیتا ہوں کہ جب میں اپنی تمام محنت "کریم الدین صاحب" کے نذر کر رہا ہوں تو جو کچھ بُرا بھلا آپ کو اس مضمون کے متعلق کہنا ہے وہ مجھے نہ کیئے، مولوی صاحب کو کیئے اور خوب دل بھر کر کیئے۔ میں خوش اور مسرہ خدا خوش۔ والسلام :-

مرزا فرحت الشد بیگ

۲۔ تذبذب

ہوس کو ہے نشاط کا کیا کیا نہ ہو مرزا تو جینے کا مز کیا

میرزا نام کریم الدین ہے، میں پانی پت کا رہنے والا ہوں۔ یہ قصبہ دہلی سے ہم کوں پر بجان شمال مغرب واقع ہے اور اپنی لڑائیوں کی وجہ سے تاریخ میں مشہور ہے۔ ہم اچھے کھاتے پیتے لوگ تھے۔ مولویوں کا خاندان تھا، لیکن زمانہ کی گردش نے ایسا پیسا کر کوڑی کوڑی کو محتاج ہو گئے، جائیداد ضبط ہو گئی، میرے دادا صاحب قبلہ ایک مسجد میں جابیٹھے اور اللہ اللہ کر کے گزار دی۔ جب ضبط شدہ جائیداد کے متعلق دریافت شروع ہوئی تو توکل نے اُن کا دامن پکڑ لیا، اپنی جگہ سے نہ ہلے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ہمیشہ کے لیے روٹیوں کا سہارا کھو بیٹھے۔ میرے والد سراج الدین مرحوم بمصدق عصمت بی بی ازبے چادری متوکل سے رہے اور مسجد میں ایسے بیٹھے کہ مرا کر اُٹھے۔ میں ۱۲۳۳ھ میں عین عید الفطر کے دن پیدا ہوا

میری تعلیم انہی دو بزرگوں کے ہاتھوں ہوئی۔ لیکن بے چین طبیعت اور خاندانی جھگڑوں نے آخر پانی پت چھڑایا۔ اُس زمانہ میں دہلی میں علم کا بڑا چرچا تھا۔ ہر فن کے کاملوں سے دہلی بھری پڑی تھی۔ ہر سمت علم کے چستے جاری تھے۔ ”ملا کی روڑ مسجد“ میں بھی پانی پت چھوڑ دہلی آگیا۔ شہر میں چھاپے خانے نئے نئے چلے تھے۔ کاپی نویسی سے گزارا کرتا، محنت مزدوری کے بعد بھی ذوق علم ہر حلقہ درس میں مجھے لے جاتا۔ اسی زمانہ میں دہلی کالج کی تنظیم جدید ہوئی تھی طالب علموں کی تلاش تھی۔ میں بھی ۸ سال کی عمر میں وہاں شامل ہو گیا۔ سولہ روپیہ وظیفہ بھی مقرر ہوا، اور اس طرح میں نے علم کی پیاس بڑی حد تک بجھائی، لیکن یہ وہ زمانہ نہیں تھا کہ علم کو علم کے لیے حاصل کیا جاتا۔ اب اس کے ساتھ گزارہ کی ایک بڑی شق لگ گئی تھی۔ اس لیے چند دوستوں کے ساتھ ملکر ایک مطبع کھولا۔ قاضی کے حوض پر مبارک النصار بیگم کی حویلی کراہ پرلی۔ عربی کی مشہور مشہور کتابوں کے ترجمے چھاپے، لیکن مطبع جیسا چلنا چاہیے تھا نہ چلا۔ یہ اردو شاعری کے شباب کا زمانہ تھا۔ بادشاہ سے لیکر فقیر تک سب اسی رنگ میں رنگے ہوئے تھے، خیال آیا کہ ایک شاعرہ قائم کر کے شعرا کے حالات اور اُن کا کلام مطبع کروں، ممکن ہے کہ اس طرح مطبع چل جائے مجھے شاعری سے نہ کبھی لگاؤ تھا اور نہ اب ہے، بلکہ شعر کہنا میں بُرا جانتا ہوں، کیونکہ اہل علم کا یہ پیشہ نہیں ہے۔ وہ لوگ جو معیشت سے فانیغ البال ہیں اپنے دل بہلانے اور حسرت نکالنے کے لئے شاعری کرتے ہیں۔

میں خود عالم ہوں، میرے باپ دادا عالم تھے، بھلا میں تو اس قسم کی فضولیات کی طرف توجہ بھی نہ کرتا۔ مگر کیا کروں، ضرورت سب خیالات پر حاوی ہو گئی اور مجھے قیام شاعرہ پر مجبور کیا۔ لیکن بڑی مصیبت یہ ہے کہ

ایک تو اس شہر میں غریب اور خاص کر پرولسی غریب کو منہ نہیں لگاتے، دوسرے یہ کہ میری جان پہچان تھی تو مولویوں سے۔ وہ بھلا اس معاملہ میں میرا کیا ساتھ دے سکتے تھے۔ سوچتے سوچتے نواب زین العابدین خاں، عارف، پرنسٹری اُن سے دوچار دفعہ ملنا ہوا تھا۔ بڑے خوش اخلاق آدمی ہیں، لال کنویں کے پاس ایک حویلی ہے اُس کو مدرسہ بھی کہتے ہیں، وہاں رہتے ہیں۔ کوئی ۳۰ سال کی عمر ہے، گوری رنگت، اونچا قد اور نہایت جامہ زیب آدمی ہیں۔ البتہ ڈاڑھی بھر کر نہیں نکلی ہے، ٹھڈی ہی پر کچھ گنتی کے بال ہیں۔ غالب کے بھانجے بھی ہیں اور شاگرد بھی۔ کچھ عرصہ تک شاہ نقیر سے بھی اصلاح لی ہے، بہر حال اُن کی محبت، اُن کی شرافت، اور سب سے زیادہ اُن کے رسوخ نے مجھے اُن کی خدمت میں حاضر ہونے اور اس بارے میں ان کی امداد حاصل کرنے پر مجبور کیا۔ ایک روز صبح ہی صبح گھر سے نکل اُن کے مکان پر پہنچا۔ معلوم ہوا کہ وہ حکیم احسن اللہ خاں صاحب وزیر اعظم کے مکان پر تشریف لے گئے ہیں حکیم صاحب کا مکان سرکی والوں ہی میں تھا۔ واپسی میں دروازہ پر دریافت کیا تو معلوم ہوا کہ نواب زین العابدین خاں اندر ہیں۔ چوہدرے کے ذریعہ سے اطلاع کرائی۔ اُنھوں نے اندر بلا لیا۔ بڑا عالیشان مکان ہے، صحن میں نہر ہے، سامنے بڑا چبوترہ ہے اور چبوترے پر بڑے بڑے دالان دروالان، مکان خوب آراستہ پر راستہ ہے، ہر چیز سے امارت نکلتی ہے، سامنے گاؤ تکیے سے لگے نواب صاحب بیٹھے تھے، میں نے تو اُن کو پہچانا بھی نہیں، سو کھ کھکاٹا ہو گئے تھے اور چہرے پر جھریاں پر گئی تھیں۔ میں نے سلام کر کے کیفیت پوچھی، کہنے لگے۔ ”مولوی صاحب کیا کہوں کچھ دل بیٹھا جاتا ہے بظاہر کچھ مرض بھی معلوم نہیں ہوتا، علاج کر رہا ہوں مگر بے نتیجہ۔ بھئی اب ہمارے چل چلاؤ کا زمانہ ہے، کچھ دنوں دنیا کی ہوا کھا ہے

ہیں، مگر یہ تو کہئے آج آپ کدھر نکل آئے۔“ میں نے واقعات کا اظہار کر کے ضرورت بیان کی، تھوڑی دیر تک سوچتے رہے۔ پھر ایک آہ بھر کر کہا۔ ”میاں کریم الدین! تم کو بات تو ابھی سوچنی ہے، مگر بھئی اس کا بنا ہنا مشکل ہے۔ تمہیں خبر نہیں دہلی کے پہلے مشاعروں نے کیا کچھ دلوں میں فرق ڈال دیا ہے۔ دل تو میرا بھی چاہتا ہے کہ مرتے مرتے ایک ایسا مشاعرہ دیکھ لوں جس میں یہاں کے سب کا ملین فن جمع ہو جائیں۔ مگر مجھے یہ میل ہنڈھے چڑھتی معلوم نہیں ہوتی۔ اچھا تم بھی کوشش کرو، میں بھی کرتا ہوں۔ ممکن ہے کہ کوئی صورت نکل آئے ہاں ٹھہرو، حکیم صاحب کو آنے دو، ایک تجویز ذہن میں آئی ہے، اگر چل گئی تو میری بھی آخری تمنا پوری ہو جائیگی اور تمہارا بھی کام نکل جائیگا۔ ہم یہ باتیں کر ہی رہے تھے کہ حکیم احسن اللہ خاں صاحب نکل آئے۔ گورے چٹے آدمی ہیں، سفید بھری ہوئی ڈاڑھی، گول چہرہ، اُس میں کچھ چیچک کے داغ، آنکھوں سے ذہانت ٹپکتی تھی، سر سے پاؤں تک سفید لباس پہنے ہوئے تھے، فن طب میں کامل اور تالیخ کے عالم ہیں۔ میں آداب بجالایا۔ میری طرف مسکرا کر دیکھا۔ اور نواب صاحب سے کہا، آپ کی تعریف کیجئے۔“ انہوں نے کہا ”یہ میرے قدیم ملنے والوں میں سے ہیں۔ خود شاعر نہیں مگر شعر فہم ہیں۔ آج کل خیال پیدا ہوا ہے کہ شعرائے دہلی کا ایک تذکرہ لکھیں اور اس میں اُن کے حلیے اور اُن کے کلام کے نمونے دکھائیں۔ مجھ سے مشورہ کرنے آئے تھے۔ آپ جانتے ہیں مجھے ان چیزوں سے عشق ہے۔ اب اپنا آخری وقت ہے۔ جی چاہتا ہے کہ پُرانے رنگ کا ایک مشاعرہ اور دیکھ لوں اگر آپ مدد فرمائیں تو نئے شکل آسان ہو سکتی ہے۔“ حکیم صاحب کہنے لگے ”میاں عارف خدا کے لیے تم ایسی مایوسی کی باتیں نہ کیا کرو۔ ابھی جوان ہو، انشاء اللہ خود طبیعت مرض پر غالب آ جائیگی، اور تمہیں مرض ہی کیا ہے، وہم

ہی وہم ہے، مگر ہاں یہ تو بتاؤ تم مجھ سے کس قسم کی مدد چاہتے ہو؟" نواب صاحب نے کہا "حکیم جی اور کچھ نہیں آنا کرو کہ میاں کریم الدین کو بارگاہ جہاں پناہی تک پہنچا دو، میں خود جاتا مگر بہت نہیں ہوتی، میں ان کو سب کچھ سمجھا دوں گا۔ اگر حضرت ظل اللہ اپنا کلام بھیجنے پر راضی ہو گئے تو مشاعرے کا جم جانا کوئی مشکل کام نہیں اور اگر بد قسمتی سے انکار ہو گیا تو پھر مشاعرے کا خیال کرنا ہی فضول ہے، اب رہا مشاعرے کا انتظام وہ میں خود کر لوں گا۔ کیونکہ یہ بیچارے ان چیزوں کو کیا سمجھیں؟ حکیم صاحب پہلے تو کچھ سوچتے رہے۔ پھر کہا "عارف! تمھارے لئے میں سب کچھ کرنے کو تیار ہوں، اس لئے اور بھی کروں گا کہ اس سے تمھاری طبیعت بہل جائیگی اور کچھ دنوں اس شغلے میں لگ کر ممکن ہے کہ تمھارے دل سے مرض کا دہم جاتا رہے۔ بادشاہ سلامت سے تو میں کہتا نہیں، ہاں آپ کے دوست کو صاحب عالم مرزا فتح الملک بہادر سے ملا دیتا ہوں۔ ان کو آجکل مشاعرہ کی لو لگی ہوئی ہے۔ حضور سے بھی کئی مرتبہ عرض کر چکے ہیں مگر وہ مال گئے اگر ان صاحب نے ذرا بھی زور دیا تو مجھے یقین ہے کہ صاحب عالم کہہ سن کر ضرور اجازت حاصل کر لیں گے۔ اچھا تو مولوی صاحب کل آپ ایک بجے قلعہ معلیٰ میں آجائیے۔ میں جو بدار سے کہے جاتا ہوں، یہ اندر پہنچا دینگا۔ آگے آپ جانیں اور اپنی قسمت یہ کہہ کر حکیم صاحب نے خدا بخش کو آواز دی، وہ آیا تو اس سے کہا کہ کل یہ صاحب خویلی میں

ملے ان کا نام مرزا فتح الدین، خطاب مرزا فتح الملک، شاہ بہادر، عرف مرزا فخر اور تخلص مرزا بہادر شاہ ثانی کے سنبھلے بیٹے تھے۔ مرزا محمد دارابخت عرف مرزا شبوبہ ولیمہ سلطنت کے انتقال کے بعد ۱۱۸۶ میں ولیمہ ہوئے۔ مگر قدرے پہلے ہی ۱۱۸۵ میں ۱۰ جولائی ۱۱۸۵ میں ۱۰ سال کی عمر میں انتقال کیا۔ ان کے انتقال کے بعد مرزا جوان بخت کی ولیمہ کی جھگڑے پڑے۔

۱۱۸۵ قلعہ دہلی کو لال خویلی یا صرٹ خویلی کو بھی کہا جاتا ہے۔ حافظ عبدالرحمن احسان کا شعر ہے کہ
مری تخواہ لوئی ان لیسروں نے خویلی میں بہادر شاہ غازی کی دو ہائی جو دو ہائی ہو

ایک بجے آئیگئے، ان کو میری بیٹھک میں پہنچا دیتا، یہ کہہ کر وہ نواب صاحب کی طرف متوجہ ہو گئے اور میں آداب کر کے واپس چلا آیا۔

دوسرے روز ایک بجے کے قریب میں مولویانہ ٹھاٹھ سے جبہ پہن، شملہ باندھ قلعہ معلیٰ پہنچا۔ لاہوری دروازہ کے باہر خدا بخش کھڑے ہوئے تھے وہ مجھ کو حکیم صاحب کی بیٹھک میں لے گئے۔ یہ بیٹھک جس کو پہلے زمانے میں "نشست" کہا جاتا تھا، دیوان عام سے علی ہوائی تھی۔ حکیم صاحب بیٹھے کچھ لکھ رہے تھے، مجھے دیکھ کر بولے۔ اچھی مولوی صاحب! میں نے آپ کا کام کر دیا ہے۔ صاحب عالم مرزا فتح الملک بہادر سے صبح ہی کو ملنا ہو گیا، وہ اس تجویز سے بڑے خوش ہوئے۔ فرماتے تھے، جہاں پناہ سے میں اجازت لیے لیتا ہوں، مگر مشاعرے کا انتظام ایسا ہونا چاہیے کہ ہم لوگ بھی آسکیں، خیر بیٹھے شاید ابھی آپ کی یاد ہو۔ میں ایک طرف بیٹھ گیا۔ بیٹھا ہی تھا کہ چوہدار نے آکر کہا، "وہ کریم الدین کون صاحب ہیں ان کو حضور والا یاد فرماتے ہیں"، یہ سننا تھا کہ میرے پسینے چھوٹ گئے۔ میں سمجھا تھا کہ حکیم صاحب ہی کے پاس جا کر معاملہ طے ہو جائے گا، یہ کیا خبر تھی کہ بارگاہ جہاں پناہ میں یاد ہوگی، اور یاد بھی ایسے وقت کہ میرا سانس بھی پیٹ میں پوری طرح نہ سمایا ہوگا۔ "حکم حاکم مرگ مفاجات" اٹھا اور چوہدار کے پیچھے پیچھے روانہ ہوا۔ تمام راستے آیتہ الکرسی پڑھتا۔ آنکھ اٹھا کر یہ بھی نہ دیکھا کہ یہ بندہ خدا کدھر لے جا رہا ہے اندر سے قلعہ دیکھنے کا مدت سے شوق تھا، اب جو موقع ملا تو کن انکھیوں سے بھی دیکھنے کی ہمت نہ ہوئی۔ چلتے چلتے آندھ آگئی۔ آخر خدا خدا کر کے چوہدار نے دیوان خاص کی سیڑھیوں کے پاس لے جا کھڑا کر دیا اور آپ اندر اطلاع دینے چلا گیا۔ حضرت جہاں پناہ اس وقت حمام میں رونق افروز تھے۔ جن صاحبوں

نے دہلی کا قلعہ نہیں دیکھا ہے وہ شاید نہ سمجھ سکیں کہ گرمیوں میں حمام میں بیٹھنے کے کیا معنی؟ اصل یہ ہے کہ یہ حمام کیا ہے ایک عالی شان عمارت ہے اس کے دو درجے ہیں، ایک گرم اور دوسرا سرد عمارت کا جو حصہ موتی مسجد کی جانب ہے، وہ گرم ہے اور جو جنما کے رخ پر ہے وہ سرد ہے۔ ریتی کے رخ خس کے پردے ڈال کر خس خانہ بنالیا جاتا ہے۔ اندر نہر بہتی ہے۔ بیچ میں کئی بڑے بڑے حوض ہیں، ان میں نوارے چلتے ہیں۔ حمام کیا ہے ایک بہشت کا ٹکڑا ہے۔ چوہدار جو گیا تو آنے کا نام نہیں لیتا۔ دھوپ میں کھڑے کھڑے فشار ہو گیا۔ پسینہ میں تر تر گردن نیچے کیے کھڑا ہوں اور ناک پسینے کی بندیں ٹپ ٹپ گر رہی ہیں۔ ارادہ ہوا کہ واپس چلا جاؤں، مگر اول تو طلبی کے بعد بھاگ جانا ہی نا زیبا۔ دوسرا راستہ کس کو معلوم۔ خدا خدا کر کے مشکل آسان ہوئی اور چوہدار نے آکر کہا کہ ”چلیے“ اس ایک لفظ نے خود بخود پانوں میں لغزش اور دل میں کپکپی پیدا کر دی۔ خیر کسی نہ کسی طرح اُلٹے سیدھے پانوں ڈالتا، حمام مبارک میں داخل ہو گیا۔ چوہدار نے آواز دی ”ادب سے“ نگاہ روبرو، حضرت جہاں پناہ سلامت، ”آداب بجالاؤ۔“ میں نواب بن لعابدین خاں صاحب سے یہ سبق پورا اور اچھی طرح پڑھ کر آیا تھا۔ دُہرا ہو کر سات تسلیمات بجالایا اور نذر گزارانی۔ نذر دیتے وقت ذرا آنکھ اوپنی ہوئی تو وہاں کارنگ دیکھا، حضرت پیرو مرشد ایک چاندی کی پلنگائی پر لیٹے تھے، پائینتی مرزا خرو بیٹھے پاؤں دبار ہے تھے۔ دہلی میں وہ کون ہے جس نے حضرت ظل اللہ کو نہیں دیکھا۔ میاں قد، بہت نحیف جسم، کسی قدر لمبا چہرہ۔ بڑی بڑی روشن آنکھیں، آنکھوں کے نیچے کی ہڈیاں بہت ابھری ہوئی، لمبی گردن چوکا ذرا اونچا، پتلی مستواں ناک، بڑا دبانہ، گہری سائلی رنگت، سر نہنڈا ہوا

چھدر سی ڈاڑھی، کلوں پر بہت کم، ٹھوڑی پردہ زیادہ، لبیس کتری ہوئی۔
 (۷۰) برس سے اونچی عمر تھی، بال سفید بھک ہو گئے تھے۔ لیکن کچھ بھی ڈاڑھی
 میں اٹکاؤ کا سیاہ بال تھا۔ چہرے پر جھریاں تھیں، لیکن باوجود اس
 پیرانہ سالی اور نقاہت کے آواز میں وہی کراہن تھا۔ سبز کجواب کا ایک بر
 کا بیجامہ اور سفید ڈھاکے کی ملل کا کرتہ زیب بدن تھا۔ سامنے ایک چوکی پر
 جامہ وار کی تختان اور کار چوبی چوگوشیہ ٹوپی رکھی ہوئی تھی۔ اب رہے
 مرزا خرو تو وہ عین میں باپ کی تصویر تھے۔ ۳۲، ۳۳ برس کی عمر تھی، فرق
 تھا تو لبس ہی کہ وہ بڑھے تھے، یہ جوان۔ اُن کا رنگ بڑھاپے کی وجہ سے
 ذرا کلوٹس لے آیا تھا، ان کا کھلا گیواں رنگ تھا۔ اُن کی داڑھی سفید
 تھی، ان کی سیاہ ورنہ یہی معلوم ہوتا تھا کہ ایک بادشاہ لیٹے ہیں اور ایک
 بیٹھے ہیں۔ دونوں نے مجھ پر ایک گہری نظر ڈالی اور بادشاہ سلامت نے
 فرمایا۔ ”اماں بھٹا را ہی نام کریم الدین ہے! تم کہیں باہر کے معلوم ہوتے
 ہو؟“ میں نے کہا کہ ”خانہ زاد پانی پت کا رہنے والا ہے۔ بچپن ہی سے
 حضرت ظل اللہ کے سایہ عاطفت میں آ رہا ہے۔“ فرمایا ”اماں! ابھی بھٹا را ہی

۱۷ قلعہ دہلی کے دورِ آخر میں شاہانِ دہلی بعض وقت مرد عورت دونوں کو ”اماں“ سے خطاب
 کیا کرتے تھے۔ اس پُرانے طرزِ کلام کی جھلک حیدر آباد کی روزمرہ میں بھی کسی قدر نظر آتی ہے، مجھے بڑا
 تعجب ہے کہ ایک مورخ نے اس طریقہٴ مخاطبت کی بنا پر قلعہٴ معلیٰ کی تہذیبِ اخلاق پر حکم کیا جو اور لکھا جو کہ
 بادشاہ کے اخلاق کی بستی کا اندازہ اس سے کیا جاسکتا ہو کہ وہ اپنی بیوی کو بھی ”اماں“، کہتا تھا؟ معلوم ہوتا
 ہے کہ یہ صاحبِ نگریزی نہیں جانتے تھے ورنہ انکو یہ پڑھ کر تعجب ہوتا کہ جس قوم کو وہ تہذیب کا پتلا اور انضام
 کا نمونہ بنا کر رہتے ہیں ان کے ہاں بھی خاندانی بیوی کو ”اماں“ ہی کہتا ہو اور بیوی خاندان کو بھی ”اماں“ کہتی
 ”دادا“ پکارتی ہے۔ (میرے خیال میں یہ ”ارے میان“ کا اختصار ہے۔ چنانچہ اب بھی
 بے تکلف بول چال میں میاں کو ماں ہی کہہ جاتے ہیں۔) (ڈبٹر رسالہ اردو)

تذکرہ مرزا فخر کو رہے تھے۔ میرا خود جی چاہتا ہے کہ پہلے کی طرح دیوان عام میں مشاعرہ کروں، مگر کیا کروں۔ زمانہ کی ہوا ایسی بگڑ گئی ہے کہ مناسب نہیں معلوم نہیں تھا یہ صحیح ہے کہ ”بود ہم پیشہ با ہم پیشہ دشمن“ لیکن خدا محفوظ رکھے ایسی دشمنی بھی کس کام کی کہ دو گھڑی مل جل کر نہ بیٹھنے دے۔ دیوان عام میں مشاعرہ ہوتا تھا، وہ کچھ دنوں ٹھیک چلا، پھر میں نے دیکھا کہ بے لطفی بڑ رہی ہے۔ اس لیے بند کر دیا۔ منشی فیض پارسا نے اجیری دروازے کے باہر غازی الدین خاں کے مدرسہ میں مشاعرہ شروع کیا، وہ تیلیوں کی طرح بکھر گیا۔ وہ تو کو غنیمت ہوا کہ لڑکھائیاں ”تیلیاں“ ہی تھیں، کہیں خدا نخواستہ اگر ردیف ”لکڑیاں“ ہوتیں تو خدا معلوم کتنوں کے سر پھوٹ جاتے۔ تم مشاعرہ تو کر رہے ہو مگر ان ہاتھیوں کی ٹکڑ کیسے سنبھالو گے۔ استاد ذوق تو بچا سے بے زبان آدمی ہیں، مگر خدا بچائے حافظ ویران سے وہ ضرور لڑ مرینگے۔ اور تم جانتے ہو ”اندھے کی داد نہ فریاد اندھا مار بیٹھے گا“ کی صورت ہے۔ کسی نے اگر مشاعرے میں استاد پر زرا بھی چوٹ کر دی تو ان نابینا صاحب کا سنبھالنا مشکل ہو جائیگا۔ میاں تم سے یہ کام سنبھالنے پر نہیں آتا۔ میں نے عرض کی کہ ”قبلہ عالم میری کیا ہمت ہے جو میں اتنے بڑے کام میں ہاتھ ڈال سکوں، مشاعرے کا سارا انتظام نواب زین العابدین خاں عارف نے اپنے ذمے لیا ہے۔“ فرمایا ”تو پھر مجھے اطمینان ہے۔ یہ لڑکا بڑا ہشیار اور ذہین ہے، مرزا نوشہ اور مومن خاں کو وہ سنبھال لے گا، رہے استاد ذوق ان سے میں کمدونگا۔ خدا نے چاہا تو اس طرح مشاعرہ چل جائیگا۔ مگر میں یہ کہنے دیتا ہوں کہ مشاعرے سے پہلے ان لوگوں سے مل لو کہیں ایسا نہ ہو کہ وقت پر انکار کر بیٹھیں۔ میں اور مرزا شہباز تو انہیں سکتے ہیں ہاں مرزا فخر کو اپنی جگہ بھیج دوں گا اور انشا اللہ اپنی غزل بھی بھجوں گا۔ ہاں

یہ تو بتاؤ کہ تم نے ”طرح“ کیا رکھی ہے؟ ”طرح“ ہی تو بڑے جھگڑے کی چیز ہے یہ ذرا سوچ سمجھ کر دینا۔ یہ باتیں ہو ہی رہی تھیں کہ بازو سے آواز آئی۔ ”اے ہے یہ انا بچہ کو کیا بے طرح سلا گئی ہے۔“ یہ سُنتے ہی بادشاہ سلامت نے فرمایا ”لو بھائی یہ خود بخود فال گوش مل گئی۔ تم اس مشاعرے میں کوئی ”طرح“ ہی نہ دو۔ جس شخص کا جس بحر، جس ردیف قافیہ میں غزل پڑھنے کو دل چاہے پڑھے۔ نہ لینا ایک نہ دینا دو۔“ میں نے عرض کی پیر و مرشد تاریخ؟ ”فرمایا“ ”ہر رجب مقرر کر دو۔ دن بھی اچھا ہے، چاندنی رات بھی ہوگی، آج پانچ تاریخ ہے نو دن باقی ہیں، اتنے دنوں میں بہت کچھ انتظام ہو سکتا ہے۔ انگریزی کی ۲۰ جولائی پڑگی موسم بھی ٹھنڈا ہو جائے گا۔ اچھا اب خدا حافظ۔“ میں نے عمر و دولت و اقبال کو دعا دی اور خوش خوش اُلٹے قدموں واپس ہوا۔ مرزا خرد و بیچ میں نہیں بولے مگر میں سمجھتا تھا کہ یہ سب کیا دھرا اٹھیں کا ہے، ورنہ کہاں میں کہاں یہ خلوت شاہی۔ بیچ ہے ”بگڑی بن جاتی ہے جب فضل خدا ہوتا ہے“ یہاں میں اتنا ضرور کہوں گا کہ میرے لیے حضورِ اِتنی مشکل نہ تھی جتنا حضرت ہو کر یہ اُلٹے پانوں چلنا ہوا۔ زمین پانوں کو نہیں لگی تھی، اسلئے دو چار قدم ہی چلا ہوں گا کہ پیچھے ایک دیوار سے ٹکرایا اس ٹکڑے سے ذرا سنبھلا تھا کہ نہر میں پانوں جا پڑا۔ خیر ہزار مشکل اس جادو ادب کو طے کر کے باہر نکل ہی آیا۔ ادھر میں نکلا، اُدھر چو بدار ساتھ ہوا۔ اس کو انعام دے ولا کر نالا، حکیم صاحب کے پاس آیا، وہ میرے انتظار ہی میں بیٹھے تھے۔ اُن سے تمام واقعہ بیان کیا۔ فرمانے لگے۔ ”موادی صاحب! بات یہ ہے کہ مرزا خرد بہت دنوں سے مشاعرے کے لئے بے چین ہو رہے تھے، اُنھیں کی یہ کارگزاری ہے، ورنہ بھلا یہ معاملہ اس طرح کھوڑی طے ہوتا، مگر چلو تمہارا کام بن گیا۔ میاں عارف سے بھی جا کر کہہ دو

وہ میرے ہی ہاں بیٹھے انتظار کر رہے ہوں گے۔

حکیم صاحب کے مکان پر پہنچا تو دیکھا کہ واقعی نواب صاحب میرے انتظار میں بیٹھے ہیں۔ ان سے حالات بیان کیے۔ کہنے لگے کہ ”چلو یہ مشکل تو آسان ہوئی۔ اب تم یہ کرو کہ کل کم سے کم استاد ذوق، مرزا نوشہ اور حکیم مومن خاں کے مکان کا گشت لگا ڈالو، مگر دیکھنا ذرا چھونک چھونک کر قدم کھنا یہ تینوں بڑے دماغ دار آدمی ہیں، اگر ذرا بھی تم سے بات چیت میں لغزش ہوئی تو یاد رکھو کہ بنانا یا کھیل بگڑ جائیگا۔ جب دیکھو کہ ان میں سے کوئی ہاتھوں سے نکلا ہی جاتا ہے تو میرا نام لے دینا۔ کیا عجب ہے کہ میرا نام سن کر راضی ہو جائیں دوسری بات یہ ہے کہ مبارک النساء بیگم کی حویلی جس میں تمہارا مطبع ہے دو روز میں خالی کر کے بالکل میرے حوالے کر دو، مجھے وہاں نشست کا انتظام کرنا ہوگا۔“ میں نے عرض کی ”اور میں کہاں جاؤں؟“ فرمانے لگے ”میرے مکان میں آٹھ نو روز کے لیے آ جاؤ۔ تم کو تکلیف تو ہوگی مگر کیا کیا جائے۔ جب قلعہ کے لوگوں کو بلارہے ہیں تو انھیں کسے رتبے کے موافق مکان کو بھی درست کرنا ہوگا دیکھئے خرچ کیا پڑتا ہے۔“ میں نے کہا ”مشاعرے میں خرچ ہی ایسا کونسا ہوتا ہے۔ زیادہ سے زیادہ سوا سو روپے اٹھ جائینگے۔“ یہ سنکر نواب صاحب مسکرائے اور کہا ”میاں کریم الدین۔ تم کیا جانو کہ ایسے مشاعروں میں کیا خرچ ہو جاتا ہو ہزار دو ہزار میں بھی اگر پوچھ پورا ہو گیا تو سمجھو کہ سستے چھوٹے یہ سنکر تو میرے ہاتھوں کے طوطے اڑ گئے۔ میں نے کہا ”نواب صاحب! اگر یہ صورت ہے تو میرا ایسے مشاعرے کو دور ہی سے سلام ہے، مطبع تو مطبع اگر اپنے آپ کو بیچ ڈالوں تو اتنی رقم نہ اٹھے۔“ فرمانے لگے ”بھئی تم اس خرچ کے جھگڑے میں نہ پڑو خدا مشکل بھی آسان کر دیکھا۔ جب میں نے اس کام میں ہاتھ ڈالا ہے تو میں جانوں

اور میرا کام جانے۔ تم بیٹھے تماشہ دیکھو۔ مگر ہاں مکان کل تک خالی کر دینا۔ نوہی دن تو رہ گئے ہیں، رات کم اور سوانگ بہت ہے، اب جاؤ خدا حافظ۔ تم تھک بھی گئے ہو، ذرا آرام لے لو۔ اور کل صبح ہی سے ادھر مکان خالی کرے کی فکر کرو، ادھر ان تینوں استادوں کے مکان کا چکر لگاؤ۔ مکان خالی ہو جائے تو فوراً مجھے اطلاع دینا اور خود میرے ہاں چلے آنا۔ اس میں شرم کی کوئی بات ہی آخر میرے ہی وجہ سے تو تم اپنا مکان چھوڑ رہے ہو۔“ وہاں سے نکل کر میں اپنے گھر آیا۔ مطیع کو بند کرتے کرتے اور سامان کو سیٹھتے سیٹھتے شام ہو گئی صبح اٹھ کر اپنے پسینے اور بھنے کا سامان تو نواب زین العابدین خاں کے مکان پر روانہ کیا اور خود کابلی دروازہ کی طرف چلا کہ پہلے استاد ذوق ہی سے بسم اللہ کر دوں۔ کابلی دروازہ کے پاس ہی ان کا مکان ہے، مکان بہت چھوٹا ہے، چھوٹی سی ڈیوڑھی ہے، اس میں ایک طرف جائے ضرور ہے۔ اندر صحن اتنا چھوٹا ہے کہ دو پلنگ کچھنے کے بعد راستہ چلنے کے لیے مشکل سے جگہ رہتی ہے سامنے چھوٹا سا دالان ہے اور اسکے اوپر ایک کمرہ۔ صحن میں سے زنانے مکان میں راستہ جاتا ہے۔ جب میں پہنچا تو استاد صحن میں بان کی گھڑی چار پائی پر بیٹھے حُقتہ پی رہے تھے۔

دوسری چار پائی پر ان کے چاہتے شاگرد حافظ غلام رسول ویران بیٹھے تھے یہ اندھے ہیں اور انہی سے ہوشیار رہنے کے لیے حضرت جہاں پناہ نے ارشاد فرمایا تھا۔ استاد ذوق قد وقامت میں متوسط اندام ہیں، رنگ اچھا سانولا ہے، چہرے پر چچک کے بہت داغ ہیں، آنکھیں بڑی بڑی اور روشن اور نگاہیں تیز ہیں، چہرے کا نقشہ کھڑا کھڑا ہے۔ اس وقت سفید تنگ پیجامہ، سفید کُرتہ اور سفید ہی انگرکھا پہنے ہوئے تھے۔ سر پر مل کی ٹوپی

گول چند وے کی تھی۔ میرا صحن میں قدم رکھنا تھا کہ بانوں کی آہٹ سننے ہی حافظ ویران نے چونک کر کہا "کون ہے" میں نے کہا "کریم الدین، استاد ذوق کی خدمت میں حاضر ہوا ہوں" استاد نے اپنا نام سن کر کہا۔ "آئیے آئیے، اندر تشریف لائیے" میں نے آداب کیا۔ اُنھوں نے فرمایا "بیٹھو، بیٹھو" میں حافظ ویران کے پاس چارپائی پر بیٹھ گیا۔ کہا "فرمائیے کیسے تشریف لانا ہوا؟" میں نے عرض کی کہ "میرا ارادہ قاضی کے حوض پر ایک مشاعرہ شروع کرنے کا ہے۔ ۱۴ رجب تا ریح مقرر ہوئی ہے اگر حضور بھی ازراہ ذرہ نوازی قدم رنجہ فرمائیں تو بعید از کرم نہوگا۔" میرا اتنا کہنا تھا کہ حافظ ویران تو چراغ پا ہو گئے۔ کہنے لگے "جائیے جائیے، کہاں کا مشاعرہ نکالا ہے؟ استاد کو فرصت نہیں ہے۔ اُن مرزا لے پالک لے کے پاس کیوں نہیں جاتے جو خواہ مخواہ اُن کو آکر دق کرتے ہو؟" استاد نے کہا "بھئی حافظ ویران! تمھاری زبان نہیں رکتی۔ بیٹھے بٹھائے تم دنیا بھر سے لڑائی مول لیتے ہو؟" حافظ ویران کہنے لگے "استاد، جب وہ آپ کو برا بھلا کہیں تو ہم کیوں چپ بیٹھنے لگے۔ وہ ایک کینکے تو ہم سوسنائینگے۔ اور تو اور میاں آشفہ کو دن لگے ہیں، کل ہی کی بات ہے آپ کو ناوڑا کہہ رہے تھے مگر میں نے بھی ایسی خبر لی کہ تمام عمر یاد کریں گے اُن کی سات پشت کو تو مڈالا۔" استاد ہنس کر فرمانے لگے "نا بھئی نا، تم میری وجہ سے کیوں بلا میں پڑتے ہو

۱۔ ان دنوں دہلی میں لوگوں نے یہ اڑا رکھا تھا کہ مرزا نوشہ (غالب، مرزا عبد اللہ بیگ کے بیٹے) نہیں ہیں بلکہ اُنھوں نے انکو پال لیا ہوا رہہ درہل کسی کشمیری کی اولاد ہیں نظر ویران نے اسی طرف اشارہ کیا جو چٹاٹو رکھے دہلی والوں کا جاہر ہے آیا اسکے حسب نسب میں انھوں نے میڑے ڈالے۔ استاد ذوق کو شہر بھرنائی کتا ہے۔ دوسری بات یہ کہ آنا و مرحوم نے انکے ماتھے میں اُسترے کی بجائے تلوار دیکر اُن کو سپاہی زادہ بنا دیا ہے۔

مجھے جبکہ جو جی چاہے سو سکے۔ میں نے تو ان سب کا جواب ایک باعی میں دیدیا ہے
تو بھلا ہے تو برا ہو نہیں سکتا اور ذوق ہو جو برا وہ ہی کہ جو تجھ کو برا جانتا ہے
اور جو خود تو ہی برا ہو تو وہ بیچ کتنا ہو کیوں برا کہنے سے اس کے تو برا مانتا ہے

میں نے عرض کی کہ ”میں کل بارگاہ سلطانی میں حاضر ہوا تھا۔ حضرت
نعل اللہ نے ارشاد فرمایا تھا کہ اس مشاعرے میں ہم طرزا فتح الملک بہادر کو اپنی
طرف سے بھیجیں گے اور اپنی غزل بھی بھیج کر مشاعرہ کی عزت بڑھائیں گے۔
اور یہ بھی ارشاد ہوا تھا کہ اُستاد و ذوق بھی کمدینگے وہ بھی مشاعرے میں ضرور
آئینگے۔“ یہ سن کر حافظ دیران تو ٹھنڈے پڑ گئے۔ اُستاد نے فرمایا ”ہاں بھیجی
مجھے یاد آگیا۔ کل شام کو حضرت پیر و مرشد نے مجھ سے بھی فرمایا تھا اور یہ بھی ارشاد
ہوا تھا کہ تو بھی ضرور جائیو۔ میاں میں انشا اللہ تعالیٰ ضرور آؤں گا۔ مگر یہ تو بتاؤ
”طرح“ کیا رکھی ہے؟“ میں نے واقعہ عرض کیا اور کہا کہ ”حضرت نعل سبحانی نے
”طرح“ کا جھگڑا ہی نکال دیا۔ جو شخص جس بحر اور جس ردیف قافیہ میں چاہے
آ کر غزل پڑھے۔“ اُستاد تو ”بہت خوب بہت خوب“ کہتے رہے۔ مگر حافظ
دیران کی تیوری کے بل نہیں گئے۔ برابر بڑبڑاتے ہی رہے کہ ”اللہ خیر کرے،
دیکھیے اُس مشاعرے کا کیا حشر ہوتا ہے۔ حضرت پیر و مرشد بھی بیٹھے بیٹھے
اشتعلہ چھوڑا کرتے ہیں“ وہ اپنی کہنے لگے میں تو اُٹھ سلام کر چلا آیا۔

دوسرا حملہ اسد اللہ خاں غالب پر تھا، چاندنی چوک سے ہوتا ہوا تلی مارلو
میں آیا حکیم محمود خاں صاحب کے مکان کے سامنے سے قاسم جان کی گلی کٹی ہے
بائیں طرف پہلا ہی مکان اُن کا تھا۔ یہ مکان مسجد کے پیچھے ہے، اس کے دو
دروازے ہیں ایک مردانہ دو سہرازانہ۔ محل سہرا کا ایک راستہ مردانے مکان

سے معلوم نہیں یہ کس زبان کا لفظ ہو مگر دہلی میں عام طور پر ”شگوفے“ کے معنی میں استعمال کرتے ہیں۔

میں سے بھی ہے۔ باہر کے دروازے کی دہلیز فدا دھنسی ہوئی سی ہے۔ دروازے کے اوپر ایک کمرہ ہے اور کمرے کے دونوں پہلوؤں میں دو کوٹھریاں۔ گرمی میں مرزا صاحب دوپہر کے وقت اسی ایک کوٹھری میں رہا کرتے ہیں۔ دروازے سے گزر کر مختصر سا صحن ہے اور سامنے ہی دالان در دالان۔ جب میں پہنچا تو اندر کے دالان میں گاؤٹکیوں سے لگے بیٹھے کچھ کھ رہے تھے۔

مرزا نوشہ کی عمر کوئی ۵۵ سال کی ہوگی۔ حسین اور خوشرو آدمی ہیں، تندرست اور بڑا بہت چوڑا چکلا، موٹا موٹا نقشہ اور سرخ سفید رنگ ہے۔ لیکن اس میں کچھ زردی جھلکتی ہے۔ ایسے رنگ کو محاورے میں چمپی کہا جاتا ہے آگے کے دودانت ٹوٹ گئے ہیں، ڈاڑھی بھری ہوئی ہے، مگر گھنی نہیں ہے۔ سر سنڈا ہوا، اسپر لمبی سیاہ پوسٹین کی ٹوپی ہے جو کلاہ پاپان سے ملتی جلتی ہے، ایک برکاس سفید پیجامہ، سفید ملل کا انگڑا کھاسپر ملے زرد زمین کی جامہ وار کا چٹے۔ میری آہٹ پا کر کھٹے کھٹے آنکھ اوپنی کی۔ میں نے آداب کیا، سلام کا جواب دیا اور آنکھوں سے بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ میں ایک طرف بیٹھ گیا۔ ابھی بیٹھا ہی تھا کہ نواب غیاث الدین احمد خاں آگئے۔ یہ امین الدین خاں صاحب نواب لوہارو کے بھائی ہیں۔ ریختے میں رنخشاں، اور فارسی میں نیز، تخلص کرتے ہیں، کوئی ۴۵ سال کی عمر ہے۔ انشا پر دازی، جغرافیہ، تاریخ، علم النساب، اسمائے رجال، تحقیق لغات اور واقفیت عامہ میں اپنا جواب نہیں رکھتے۔ مرزا نوشہ کے خلیفہ ہیں۔ چھوٹا قد، بہت گورا رنگ، نازک نازک نقشہ، غلافی آنکھیں، جگلی ڈاڑھی، چھریا بدن، غرض نہایت خوبصورت آدمی ہیں، ایک برکاس سفید پیجامہ اور سفید ہی انگڑا کھاپنے تھے۔ غالب چڑھی ہوئی جو گوشہ ٹوپی سر پہنتی تھی۔

لے قلعہ دہلی کے عجائب خانے میں مرزا غالب کی ایک تصویر ہے، اس سے یہ لباس کیا گیا ہو۔

ایک بڑا رومال سمو سہ بنا کر شانوں پر ڈالے ہوئے تھے۔ میں نے اُٹھ کر سلام کیا۔ اُنھوں نے بڑھ کر مُصافحہ کیا اور خاموش ایک طرف دوزانوں نہایت ادب سے بیٹھ گئے۔ تھوڑی دیر میں مرزا غالب بھی لکھنے سے فارغ ہوئے، پہلے نواب صاحب کی طرف مڑے اور کہنے لگے ”ہیں میاں نیر“ تم کس وقت آ بیٹھے۔ ابھی اس مرزا آفتہ نے میرا ناک میں دم کر دیا ہے۔ ظالم کی طبیعت کی روانی کسی طرح کم نہیں ہوتی۔ ہر خط میں آٹھ دس غزلیں اصلاح کے لیے بھیج دیتے ہیں۔ اصلاح دیتے دیتے تھک جاتا ہوں۔“ میری طرف دیکھ کر کہا ”آپ شاید مولوی کریم الدین صاحب ہیں؟“ میں نے کہا ”جی ہاں“ فرمانے لگے ”حضرت آپ کے تشریف لانے کا مقصد مجھے پہلے ہی سے معلوم ہو گیا تھا، کل ہی میاں عارف آکر مجھ سے آپ کے مشاعرے میں چلنے کا وعدہ لے گئے ہیں۔ کو میاں نیر! تم بھی چلو گے؟“ نواب صاحب نے کہا ”جہاں آپ وہاں میں۔ آپ تشریف لیجائیے تو انشاء اللہ میں بھی ضرور ہمراہ ہوں گا۔“ مرزا صاحب نے پوچھا ”مگر بھی اب تک ”علائی“ نہیں آئے۔ مجھ کو ان کا کل سے انتظار ہے۔ اے لو! وہ آ ہی گئی بھی بڑی عمر ہے، ابھی میں تم ہی کو پوچھ رہا تھا۔“

نواب علما الدین خاں علائی، نواب لوبارو کے ولیعہد ہیں۔ کوئی ۲۳، ۲۴ سال کی عمر ہے۔ متوسط قد، گندمی رنگ، موٹا موٹا نقشہ، گول چہرہ، شہرتی آنکھیں اور گھنی چڑھی ہوئی ڈاڑھی ہے۔ لباس میں غلطے کا تنگ مہری کا پیجامہ، سفید جامدانی کا انڈرکھا، اس پر سینہ کھلی ہوئی سیاہ مغل کی بنڈہ ستین اور سر پر سیاہ ہی مغل کی چوگوشیہ ٹوپی تھی، وہ بھی آداب کر کے ایک طرف بیٹھ گئے۔ اور کہا ”واقعی آج دیر ہو گئی، مجھے خود خیال تھا کہ آپ انتظار کر رہے ہوں گے۔“ میری طرف دیکھ کر کہا ”آپ کی تعریف؟“ مرزا نوشہ نے تمام قصہ

بیان کیا اور کہا ”علائی! تم کو بھی چلنا ہو گا۔ ابھی تو شاید لوہارو نہیں جا رہے ہو۔“ انھوں نے کہا ”بہت خوب آپ تشریف لے جائینگے تو میں بھی حاضر ہوں۔“ جب یہ مرحلہ بھی طے ہو گیا تو میں نے اجازت چاہی۔ وہاں سے رخصت ہو کر دین العابدین خاں کے مکان میں آیا۔ انھوں نے مردانے کا ایک حصہ میرے لیے خالی کر دیا تھا، جو اسباب صبح میں نے بھیجا تھا اُسکو جا جایا یا یا، کپڑے اتارے اندر سے کھانا آیا۔ کھانا کھا کر تھوڑی دیر سو رہا۔ چار بجے کے قریب اُٹھ کر حکیم مومن خاں کے ہاں جانے کی تیاری کی۔

حکیم صاحب کا مکان چیلوں کے کوچہ میں ہے۔ راستہ میں مولوی امام بخش صاحب صہبائی، مل گئے۔ یہ کالج میں میرے استاد رہے ہیں، کھلا ہوا گندم گوں رنگ ہے، مُنہ پر کہیں کہیں چچک کے داغ ہیں۔ سر پر پٹھے ہیں، بڑے دُبلے پتلے آدمی ہیں۔ کوئی ۴۰ سال کی عمر ہوگی۔ ایک برکاس سفید بیجامہ، سفید انگلیکا، کشمیری کام کا جُتہ پہنتے اور سر پر چھوٹا سفید صافہ باندھتے ہیں۔ یہ بھی چیلوں کے کوچہ ہی میں رہتے ہیں، مجھ سے پوچھنے لگے۔ ”کہاں جاتے ہو؟“ میں نے کہا ”حکیم مومن خاں کے پاس“ پوچھا ”کیا کام ہے؟“ میں نے حال بیان کیا۔ کہنے لگے ”چلو میں بھی وہیں جا رہا ہوں“ حکیم آغا جان کے چھتے کے سامنے خاں صاحب کا مکان تھا۔ بڑا دروازہ ہے اندر بہت وسیع صحن اور اُس کے چاروں طرف عمارت ہے۔ دو طرف صحنچیاں ہیں اور سامنے بڑے بڑے دالان دروالان، پچھلے دالان کے اوپر کمر ہے۔ سامنے کے دالان کی چھت کو کمرے کا صحن لٹوایا ہے، لیکن سُنڈیر بہت چھوٹی رکھی ہے۔ دالانوں

میں نے خود یہ مکان ۲۲، ۲۰ برس ہوئے دیکھا تھا، ٹوٹ کر گنڈڑ ہو گیا تھا۔ بینظیر عمارت ٹوٹ گئی تھی، سامنے کا حصہ قائم تھا۔ معلوم نہیں کہ اوپر کی سُنڈیر کیوں اتنی نیچی رکھی گئی تھی۔ اسی سُنڈیر سے ٹوٹ کر حکیم مومن خاں نیچے گرے۔ مگر دور بازو ٹوٹ گیا، اور اسی کی وجہ اُن کا انتقال ہوا۔ خود ہی مرے کی تاریخ کی جی ”دوست و بازو بخت“

میں چاندنی کا فرش ہے۔ اندر کے دالان میں بچوں بیچ قالین بچھا ہوا ہے۔ قالین پر گاؤں تھیکے سے لگے حکیم صاحب بیٹھے ہیں۔ سامنے حکیم سکھاندا المتخلص بہ 'رقم' اور مرزا رحیم الدین 'حیا'، مؤدب و وزانوی بیٹھے ہیں۔ معلوم ہوتا تھا کہ کوئی دربار ہو رہا ہے کہ کسی کو آنکھ اٹھا کر دیکھنے اور بلا ضرورت بولنے کا یا رانہیں۔ حکیم ہوسن خاں کی عمر تقریباً ۴۰ سال کی تھی، کشیدہ قامت تھے، سرخ و سفید رنگ تھا جسمیں سبزی جھلکتی تھی، بڑی بڑی روشن آنکھیں، لمبی لمبی پلکیں، کھنچی ہوئی بھنویں، لمبی ستواں ناک، پیلے پیلے ہونٹ، اُن پر پان کا لاکھا جاما ہوا، سہی آلودہ دانت، ہلکی ہلکی موچھیں، خشخاشی داڑھی، بھرے بھرے بازو پتلی کمر، چوڑا سینہ، لمبی لمبی انگلیاں، سر پر گھونگر والے لمبے لمبے بال زلفیں نگرہ پشت اور شانوں پر بکھرے ہیں، کچھ لٹیں پیشانی کے دونوں طرف کاکلوں کی شکل رکھتی ہیں کان کے قریب تھوڑے سے بالوں کو موڑ کر زلفیں بنا لیا تھا۔ بدن پر شرابی ملل کا نیچی چولی کا انگرکھا تھا، لیکن اُس کے نیچے گرتہ نہ تھا، اور جسم کا کچھ حصہ انگرکھے کے پروے میں سے دکھائی دیتا تھا۔ گلے میں سیاہ رنگ کا فیٹہ، اس میں چھوٹا سا سنہری تنوید، کاکریزی رنگ کے دو پٹے کو بل دیکر کمر میں لپیٹ لیا تھا اور اس کے دونوں سرے سامنے پڑے ہوئے تھے۔ ہاتھ میں پتلا سا خار پشت، پاؤں میں سرخ گلابی کا پیجامہ، مریوں پر سے تنگ اوپر جا کر کسی قدر ڈھیلا، کبھی کبھی ایک برک کا پیجامہ بھی پہنتے تھے۔ مگر کسی قسم کا بھی ہو ہمیشہ ریشمی اور قیمتی ہوتا تھا چوڑا سرخ نیفہ، انگرکھے کی آستینیں آگے سے کٹی ہوئیں کبھی لٹکتی رہتی تھیں اور کبھی اُلٹ کر چڑھا لیتے تھے، سر پر گلشن کی بڑی دو پلڑی ٹوپی، اس کے کنارے پر باریک لیس، ٹوپی اتنی بڑی تھی کہ سر پر اچھی طرح منڈھ کر آگئی تھی، اندر سے ماتنگ اور ماتھے کا کچھ حصہ اور بال صاف جھلکتے تھے غرض یہ کہ

نہایت خوش پوشاک اور جامہ زیب آدمی تھے۔ جب میں اور مولوی صہبائی دہلی پہنچے تو حکیم صاحب مرزا رحیم الدین، جیسا، سے کہہ رہے تھے کہ ”صاحب عالم! مہتابے شطرنج کے نقشوں نے میراناک میں دم کر دیا ہے! ایک ہوں، دو ہوں، آخر یہ روزِ روز کی فرمائشیں کوئی کہاں تک پوری کرے؟“ صاحب عالم نے کہا ”اُستاد کیا کروں۔ زریڈنٹ بہادر کے پاس ولایت سے شطرنج کے نقشے حل کرنے کو آیا کرتے ہیں، کچھ تو میں خود حل کر کے اُن کے پاس بھیج دیتا ہوں۔ جو سمجھ میں نہیں آتے وہ آپ کے پاس لے آتا ہوں“ حکیم صاحب نے نظر اٹھا کر ہماری طرف دیکھا۔ ہمارا سلام لیکر کہا ”بیٹھے بیٹھے، ہم بیٹھ گئے۔ اور وہ پھر صاحب عالم کی طرف متوجہ ہو کر کہنے لگے ”میاں جی! جو نقشہ تم لائے ہو تو میرے خیال میں کچھ پیچیدہ نہیں ہے۔ تم کہتے ہو کہ سرخ مہروں کو مات ہوگی میں کہتا ہوں نہیں، سبز کو ہوگی، تم بسا طر بچاؤ۔ میں ابھی سمجھائے دیتا ہوں اچھا پہلے ذرا مولوی صہبائی سے بات کر لوں۔ اور میاں سکھانند تم بیٹھے انتظار کرتے رہو، میں حکم لگا چکا ہوں کہ جب تک پورب کی طرف سے اس چھپکلی کا جوڑا نہ آجائے یہ سامنے کی دیوار سے نہ جائے گی، اسکا جوڑا آئے پر آئے۔“ سکھانند حکیم تھے، رقم تخلص کرتے تھے، دھرم پورے میں رہتے تھے۔ کوئی ۴۰ سال کی عمر تھی، ریختے میں شاہ نصیر کے اور رمل میں خاں صاحب کے شاگرد تھے، بڑے خوش پوشاک، خوش وضع، خوش اخلاق، ظریف الطبع، حلیم، خوبصورت اور شکیل آدمی تھے۔ اُستاد کا ایسا ادب کرتے تھے جیسے کوئی بیٹا باپ کا کرتا ہے، حکیم صاحب کی باتیں سنکر ”بہت خوب، بہت مناسب“ کہتے رہے اُن سے گفتگو کر کے حکیم صاحب ہماری طرف متوجہ ہوئے اور کہنے لگے ”اے بھئی صہبائی! تم تو کئی دن سے نہیں آئے! کوخیریت تو ہے۔ اور آپ کے تھایہ صاحب

کون ہیں؟ مولوی صہبائی نے کہا ”یہ پہلے کالج میں میرے شاگرد تھے، اب مطبع کھول لیا ہے، وہاں مشاعرہ کرنا چاہتے ہیں، آپ کو تکلیف دینے آئے ہیں“ حکیم صاحب نے ہنسکر کہا ”بس صاحب مجھے تو معاف ہی کیجئے۔ اب دہلی کے مشاعرہ شریفوں کے جانے کے قابل نہیں رہے۔ ایک صاحب ہیں وہ اپنی اُمت کو لے کر چڑھ آتے ہیں۔ شعر سمجھنے کی تو کسی کو تمیز نہیں۔ مفت میں واہ واہ! سبحان اللہ! سبحان اللہ! کا غل جچا کر طبیعت کو شغف کر دیتے ہیں۔ یہ نہیں سمجھتے کہ

صائب دو چیز می شکند قدر شعرا تحسین ناشناس سکوت سخن شناس
دوسرے صاحب ہیں وہ ہڈ ہڈ کو ساتھ لیے پھرتے ہیں اور خواہ مخواہ استادوں

پر حملہ کرتے ہیں۔ خود تو میدان میں آتے نہیں اپنے نا اہل بچھوں کو مقابلے میں لاتے ہیں۔ اُس روز جو اس جانور نے یہ شعر پڑھ کر کہ

مرکز محور گردوں بہ لب آب نہیں ناخن قوس قزح شبہ مضراب نہیں

کہا کہ یہ غالب کے رنگ میں لکھا ہے تو میں بیان نہیں کر سکتا کہ مجھ کو کس قدر ناگوار لگا۔ غالب کے رنگ میں شعر کہنا تو کجا وہ یا اُن کے استاد پہلے مرزا

نوشہ کے شعروں کو سمجھ تو لیں۔ اب رہے میر صاحبؒ تو اُن کی بات دوسری ہے

وہ بھی دہیات کہتے ہیں مگر کسی پر حملہ تو نہیں کرتے، بلکہ ان کی وجہ سے مشاعرے میں

کچھ چیل پیل ہوجاتی ہے۔ بھئی میں نے تو اسی وجہ سے مشاعروں میں جانا ہی ترک

کر دیا ہے۔ میں نے عرض کی کہ ”اس مشاعرے میں استاد ذوق اور مرزا نوشہ

نے آنے کا وعدہ کر لیا ہے۔ حضرت ظل سبحانی کی غزل بھی آئیگی“ فرمایا، ہر شخص

مختار ہے، چاہے خود آئے چاہے غزل بھیجے، میں تو نہ آؤنگا نہ غزل بھیجوںگا“ یہ باتیں

لے یہ استاد ذوق اور شہزادوں کی طرف اشارہ تھا۔

لے ان کا مفصل حال آگے آئیگا۔ یہ بھی عجیب مہم تھی۔

ہو ہی رہی تھیں کہ ایک بنارس کا سوداگر کپڑوں کے دو گٹھے لیکر آیا۔ شہر میں جب کوئی کپڑوں کا سوداگر آتا تو حکیم صاحب کے پاس اُس کا آنا لازمی تھا۔ ریشمی کپڑوں سے اُن کو عشق تھا۔ کوئی کپڑا پسند آتا تو پھر قیمت کی پروا نہیں کرتے تھے۔ جو مانگتا دیتے۔ اس سوداگر نے اُکرا ایک گٹھری مزدور کے سر پر سے اتاری اُس میں سے پٹ سے ایک چھپکلی نیچے گری اور دوڑ کر سامنے کی دیوار پر چڑھ گئی۔ جو چھپکلی پہلے سے دیوار پر جمی بیٹھی تھی وہ لپک کر اُس سے آ ملی۔ اور دونوں مل کر ایک طرف چلے گئے یہ ہم لوگ بیٹھے یہ تماشا دیکھتے رہے۔ جب دونوں چھپکلیاں چلی گئیں تو حکیم صاحب نے سکھانند صاحب سے کہا ”کہو میاں رقم، تم نے دیکھا؟“ اُنھوں نے کہا ”جی ہاں، ایک خانے کے حساب لگانے میں مجھ سے غلطی ہوئی۔ میں نے جو اپنی رائے پر اصرار کیا تھا اُس کی معافی چاہتا ہوں۔“ کہنے لگے، اسکا خیال نہ کرو، انسان ہی سے غلطی ہوتی ہے۔ ہاں تو میاں صہبائی، مشاعرے کے متعلق ہمارا تو صاف جواب ہے۔“ میں نے جب دیکھا کہ خاں صاحب ہاتھوں سے نکلے ہی جا رہے ہیں تو مجھے نواب زین العابدین خاں کا آخری نسخہ یاد آیا۔ میں نے کہا ”مجھے تو اس مشاعرے سے بڑے نام تعلق ہے سب کیا دھرا نواب زین العابدین خاں عارف کا ہے، وہ بہت بیمار ہو گئے ہیں اور اُن کو اب زندگی کی اُمید نہیں رہی۔ اُن کی آخری خواہش یہ کہ مرتے مرتے ایک ایسا مشاعرہ دیکھ لیں جس میں دہلی کے تمام کالمین فن جمع ہوں۔ وہ خود حاضر ہوتے مگر حکیم احسن اللہ خاں صاحب نے اُن کو کہیں آنے جلنے سے منع کر دیا ہے۔“ یہ آخری فقرہ میں نے اپنی طرف سے بڑھا دیا۔ خاں صاحب

لے یہ واقعہ ہے۔ اس کے دیکھنے والے ایک صاحب کا ابھی کوئی بیس برس ہوئے انتقال ہوا ہے۔ میں نے یہ واقعہ خود اُن کی زبانی سنا ہے۔

بڑے غور سے میری بات سنتے رہے۔ میں خاموش ہوا تو مولوی امام بخش صاحب کی طرف متوجہ ہو کر کہنے لگے "افسوس ہے، کیا خوش فکر اور ذہین شخص ہے۔ یہ عمر اور یہ مایوسی۔ سچ ہے، ہمیشہ رہے نام اللہ کا۔" میری طرف دیکھ کر کہا "اچھا بھئی، تم جاؤ، میری طرف سے عارٹ سے کم دنیا کہ میاں میں ضرور آؤں گا۔" جب میں نے دیکھا کہ یہ جادو چل گیا تو اور پاؤں پھیلائے اور کہا "نواب صاحب نے" "نواب صاحب نے یہ بھی فرمایا تھا کہ مولوی صہبائی صاحب، مفتی صدر الدین صاحب اور نواب مصطفیٰ خاں صاحب شیفٹہ کو بھی اپنے ہمراہ لائے گا تو عنایت ہوگی" حکیم صاحب کہنے لگے "میاں صہبائی سے تو میں ابھی کئے دیتا ہوں، اب ہے آرزوہ اور شیفٹہ تو واپس جاتے جاتے راستہ میں اُن سے بھی کہتے جاؤ۔ کم دنیا کہ میں نے تم کو بھیجا ہے۔ یاں تاریخ بتا کر مکان کا پتہ دیا۔" "طرح" کے متعلق حضرت جہاں پناہ کے حضور میں جو گفتگو ہوئی تھی وہ بیان کی۔ کہنے لگے "ہمارے بادشاہ سلامت بھی عجیب چیز ہیں، جو سوچتی ہے نئی سوچتی ہے۔ شاید ایسا مشاعرہ کہیں بھی نہ ہوا ہو گا جس میں "طرح" نہ وی گئی ہو۔ خیر یہ تو اچھا ہوا کہ جھگڑے کی جھونپڑا ہی نہیں رہا۔ مگر بھی بات یہ ہے کہ جب تک مقابلے کی صورت نہ ہو۔ نہ شعر کہنے میں جی لگتا اور نہ پڑھنے میں لطف آتا ہے۔" یہ کہہ کر وہ کپڑے دیکھنے میں مشغول ہو گئے اور میں سلام کر کے رخصت ہوا۔

چنکی قبر کے قریب حویلی عزیز آبادی کے سامنے مفتی صدر الدین صاحب کا مکان تھا، اس کے نزدیک مٹیا محل میں نواب مصطفیٰ خاں صاحب شیفٹہ رہتے ہیں۔ مفتی صاحب کے ہاں جا کر معلوم ہوا کہ شیفٹہ بھی مفتی صاحب ہی کے پاس بیٹھے ہیں۔ میں نے کہا چلو اس سے بہتر موقع ملنا مشکل ہے، دونوں سے ایک

ہی جگہ ملنا ہو گیا۔ یہ سوچ کر اندر گیا، مکان کو کھٹی کے منو نے کہا ہے، انگریزی اور ہندوستانی دونوں وضع کو ملا کر بنا یا گیا ہے، صحن بہت بڑا نہیں ہے۔ ایسے مختصر سی نہر ہے، سامنے والا ان در والا ان اور پہلو میں انگریزی وضع کے کمرے ہیں۔ والا نوں سے ملا ہوا اونچا صحن چبوترہ ہے۔ چبوترے کے اوپر تخت بچھے ہوئے تھے، اُن پر چاندنی کافرش اور دو طرف گاؤتیکے لگے ہوئے تھے تختوں پر مفتی صاحب اور نواب صاحب بیٹھے باتیں کر رہے تھے مفتی صاحب کی عمر کوئی ۵۶، ۵۷ سال کی تھی، گدازہ جسم، سانولا رنگ، چھوٹی چھوٹی آنکھیں، ذرا اندر کودھنسی ہوئیں، بھری ہوئی ڈاڑھی، بہت سیدھی سادی وضع کے آدمی ہیں، ظاہری نمائش سے کوئی سروکار نہیں۔ بدن میں سفید ایک برکا پیجامہ سفید کُرتہ اور سفید ہی عمامہ تھالیے جامہ زیبی میں حکیم مومن خاں کے بعد دہلی میں نواب مصطفیٰ خاں شیفۃ ہی کا نمبر تھا، اُن کا رنگ گہرا سانولا تھا لیکن ناک نقشہ غضب کا پایا تھا۔ اُس پر نیچی سیاہ گول ڈاڑھی بہت ہی بھلی معلوم ہوتی تھی۔ جسم کسی قدر بھاری اور قد متوسط تھا، لباس میں بھی زیادہ تکلف نہیں تھا تنگ مہری کا سفید پیجامہ، سفید کرتا، نیچی چوٹی کا سفید انگرکھا اور قستہ نما پچکوشیہ ٹوپی پہنے ہوئے تھے۔ تقریباً ۳۹، ۴۰ سال کی عمر ہے۔

سلے پرانے زمانے میں شرفاگر برہی پورا لباس پہنے رہتے تھے زمانے میں جانے کے خاص خاص وقت تھے ورنہ سارا وقت مردانے ہی میں گزرتا تھا۔ ہر وقت کوئی نہ کوئی ملنے جلنے والا پاس بیٹھا رہتا۔ عالم ہوئے تو درس کا حلقہ ہوتا، شاعر ہوئے تو شعر کا چرچا رہتا۔ غرض کوئی وقت بیکار نہ گذرتا، خاص خاص دوستوں سے مذاق کی گفتگو ہوتی۔ ورنہ عام طور پر اپنے کو بہت لیے دے رہتے جہاں جاؤ یہی معلوم ہوتا کہ دربار لگا ہوا ہے ہر شخص دونا نو موڈ بیٹھا ہے سبے مزوت نہ بات کی جاتی ہے نہ جواب دیا جاتا ہے، کوئی ہنسی کی بات ہوئی تو ذرا مسکرا دئے، کھلکھا کر ہنسنا معیوب اور بڑھ کر بھکڑ بولنا یا اونچی آواز میں بات کرنا خلاف ادب سمجھا جاتا تھا۔

میں آداب کر کے تخت کے ایک کونے پر دروازہ بیٹھ گیا۔ مفتی صاحب نے آنے کا سبب پوچھا۔ میں نے حکیم مومن خاں کا پیام پہنچا دیا۔ مفتی صاحب نے بڑے تعجب سے پوچھا "ہیں! خالفا صاحب نے تو مشاعرے میں نہ جانے کا عہد کر لیا ہے۔" بھئی شیفٹہ! یہ کیا معاملہ ہے؟ یا تو خود نہیں جاتے تھے یا دوسروں کو بھی ساتھ گھسیٹ رہے ہیں؟" میں نے نواب زین العابدین خاں عارف کا واقعہ بیان کیا۔ کہنے لگے "ہاں یوں کہو، یہ بات ہے۔ ورنہ مجھے تو یہ سنکر حیرت ہوئی تھی کہ حکیم صاحب اور مشاعرے میں جائیں۔ اچھا بھئی عارف سے کہہ دینا کہ میں اور شیفٹہ دونوں آئیں گے۔" میاں سے چھٹی ہوئی تو میں یہ سمجھا کہ گواہ لگنا نہ لیا۔ خوشی خوشی آکر نواب زین العابدین خاں سے واقعہ بیان کیا۔ وہ بھی مطمئن ہو گئے۔ میں نے حکیم مومن خاں کا جب حالی بیان کیا تو ان کے آنسو نکل آئے۔ کہنے لگے "میاں حکیم الدین تم کو یہ بھی معلوم ہے کہ میری حکیم صاحب سے صفائی نہیں ہے۔" میں نے کہا۔ نواب صاحب! آپ کیا فرماتے ہیں ان پر تو آپ کی بیماری سُننے کا ایسا اثر ہوا کہ بیان نہیں کر سکتا۔ شاید ان کا سگسا بھائی بھی بیمار ہوتا تو اتنا ہی اثر ہوتا۔ مفتی صاحب سے معلوم ہوا کہ انھوں نے مشاعروں میں نہ جانے کا عہد کر لیا تھا، صرف آپ کی وجہ سے انھوں نے یہ عہد توڑا ہے۔" نواب صاحب نے کہا "میاں تم کو ان لوگوں کی محبتوں کا کیا حال معلوم؟ یہ لوگ وہ ہیں کہ اپنے دشمن کو بھی مصیبت میں نہیں دیکھ سکتے۔ خیر اسکو جانے دو! اب یہ بتاؤ کہ تمہارا مکان خالی ہو گیا یا نہیں؟" میں نے کہا "جی ہاں بالکل خالی ہے۔ حکم ہو تو میں بھی خدمت میں حاضر رہ کر مدد کروں۔" فرمایا "نہیں بھئی، نہیں۔ جہاں دو آدمیوں نے ملکر کسی کام میں ہاتھ ڈالا اور وہ خراب ہوا۔ تم اس انتظام کو بس مجھ پر چھوڑ دو، بلکہ تم تو ادھر آنا ہی نہیں، تم نے آکر اگر مین سچ نکالی تو مجھ پر دہری تری محنت پڑ جائے گی۔"

۳۔ ترتیب

بہ شعر و سخن مجلس آراستند نشستند و گفتند و برخاستند
 میں تاسخ ابولقدار کے ترجمہ میں ایسا لکھ گیا کہ ، ، ۸۰ روز تک گھر سے
 باہر ہی نہیں نکلا۔ نواب زین العابدین خاں کے شوق کی یہ حالت تھی کہ باوجود
 کمزوری و قناعت کے روز صبح ہی سے جو باہر نکلتے تو کہیں رات کے آٹھ بجے
 جا کر گھر میں اُن کی صورت دکھائی دیتی۔ اس لیے ان سے ملنا نہیں ہوا کہ کچھ حال
 پوچھتا۔ بہر حال یہ آٹھ دن آنکھ بند کرتے گزر گئے اور مشاعرے کی تاسخ آہی گئی۔ حبیب
 کو شام کو ساڑھے سات بجے کے قریب میں بھی مشاعرے میں جانے کو تیار ہوا۔
 نواب صاحب کو دریافت کیا تو معلوم ہوا کہ وہ صبح سے جو گئے ہیں نواب تک واپس
 نہیں آئے۔ گھر سے جو نکلا تو بازو میں بڑی چل پل دیکھی۔ ہر شخص کی زبان پر مشاعرے
 کا ذکر تھا۔ کوئی کہتا تھا کہ یہ میاں کریم الدین کون ہیں ، کوئی کہتا کہ اس سے کیا
 کوئی ہوں مگر انتظام ایسا کیا ہے کہ دیکھ کر جی خوش ہوتا ہے۔ میں یہ باتیں سنتا اور
 دل میں خوش ہوتا ہوا قاضی کے حوض پر آیا ، کیا دیکھتا ہوں کہ سڑک کے دونوں
 جانب ٹشیاں لگا کر اور اُن میں روشنی کے گلاس جا کر رات کو دن کر دیا ہے۔
 سڑک پر خوب چھڑکا دے ، کمپور انج رہا ہے۔ مبارک اللہ! ربکیم کی حویلی کے
 بڑے پھاٹک کو گلاسوں ، قمقموں اور فنڈیلوس سجا کر گلزار آتشیں کر دیا ہے
 صدر دروازہ سے اندر کی دہلیز تک روشنی کا یہ عالم ہے کہ آنکھوں میں
 چکا چوند آتی ہے۔ مکان کے اندر جو قدم رکھا تو ہوش جاتے رہے۔ یا اللہ یہ میرا
 ہی مکان ہے یا کسی شاہی محل میں آگیا ہوں۔ گھڑی گھڑی آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر

چاروں طرف دیکھتا اور کہتا "واہ میاں عارف واہ! تم نے تو کمال کر دیا۔ کہاں بیچارے کریم الدین کا مکان اور کہاں یہ بادشاہی ٹھاٹھ؛ واقعی تمہارا کہنا صحیح تھا کہ اگر دو ہزار میں بھی کام نکل جائے تو یہ سمجھو کہ کچھ نہیں اٹھا۔" چونے میں ابرک ملا کہ مکان میں قلعی کی گئی تھی جس کی وجہ سے درو دیوار پڑے جگہ جگہ جگہ مگ کر رہے تھے۔ صحن کو بھرا کر تختوں کے چوکے اس طرح بچائے تھے کہ چوڑا ترہ اور صحن برابر ہو گئے تھے، تختوں پر وری، چاندنی کا فرش، اسپر قالینوں کا حاشیہ، پچھلے گاؤں تکیوں کی قطار، جھاڑوں، فانوسوں، ہانڈیوں دیوار گیر یوں، قمقموں، چینی، قندیلوں اور گلاسوں کی وہ بہتات تھی کہ تمام مکان بقبوہ نوز بن گیا تھا۔ جو چیز تھی خوبصورت اور جو شے تھی قرینے سے۔ سامنے کی صف کے بچوں بیچ چھوٹا سا سبز مغل کا کارچو بی شامیانہ، گنگا جہی چوبوں پر سبز ہی ریشمی طابوں سے استادہ تھا۔ اسکے نیچے سبز مغل کی کا چو بی مسند، پیچھے سبز کارچو بی گاؤں تکیہ، چاروں چوبوں پر چھوٹے ڈھبھوٹے آٹھ چاندی کے فانوس کسے ہوئے۔ فانوسوں کے کنول بھی سبز، چوبوں کے سنہری کلسوں سے لگا کر نیچے تک موٹے موٹے موتیا کے گجرے سرے کی طرح نلکے ہوئے، بیچ کی لڑکیوں کو سمیٹ کر کلابونی ڈوریوں سے جن کے سروں پر متقیں کے گچھے تھے، اس طرح چوبوں پر کس دیا گیا تھا کہ شامیانے کے چاروں طرف پھولوں کے روزے بن گئے تھے۔ دیواروں میں جہاں کھونٹیاں تھیں وہاں کھونٹیوں پر اور جہاں کھونٹیاں نہیں تھیں وہاں کیلیں گاڑ کر پھولوں کے مار لٹکا دیئے تھے، اس سرے سے اس سرے تک سفید چھت گیری جس کے حاشیے سبز تھے، کھینچی ہوئی تھی، چھت گیری کے بچوں

لے سبز رنگ دہلی کا شاہی رنگ تھا۔

بیچ موتیا کے بار لٹکا کر لڑکیوں کو چاروں طرف اس طرح کھینچ دیا تھا کہ پھولوں کی چھتری بن گئی تھی۔ ایک صحیحی میں پانی کا انتظام تھا، کورے کورے گھرے رکھے تھے اور شورے میں جبت کی صراحیاں لگی ہوئی تھیں، دوسری صحیحی میں پانی بن رہے تھے، باورچی خانے میں حقوں کا تمام سامان سلیقے سے جابجا ہوا تھا۔ جابجا نوکر صاف ستھرا لباس پہنے دست بستہ مؤدب کھڑے تھے، تمام مکان مشک عسبر اور اگر کی خوشبو سے پُر امک رہا تھا، قالینوں کے سامنے تھوڑے تھوڑے فاصلے پر حقوں کی قطار تھی، حقے ایسے صاف ستھرے تھے کہ معلوم ہوتا تھا ابھی دوکان پر سے اُٹھ آئے ہیں۔ حقوں کے بیچ میں جو کچھ جگہ چھوٹ گئی تھی وہاں چھوٹی چھوٹی تپائیاں رکھ کر ان پر خاصدان رکھ دیے تھے۔ خاصدانوں میں لال قند کی صافیوں میں لپٹے ہوئے پانی۔ گلابیوں کو صافی میں اس طرح جایا تھا کہ بیچ میں ایک ایک نہ پھولوں کی آگئی تھی، خاصدانوں کے برابر چھوٹی چھوٹی کشتیاں، اُن میں الائچیاں، چکنی ڈلیاں اور بُن دھنیا۔ مسند کے سامنے چاندی کے دو شمعدان، اندر کا فوری تیاں، اوپر ہلکے سبز رنگ کے چھوٹے کنول، شمعدانوں کے نیچے چاندی کے چھوٹے لگن، لگنوں میں کیوڑا۔ غرض کیا کہوں ایک عجیب تماشہ تھا، میں تو الف لیلہ کا ابو الحسن ہو گیا۔ جدھر نظر جاتی اُدھر ہی کی ہو رہتی تھی۔ میں اس تماشہ میں محو تھا کہ لوگوں کی آمد کی سلسلہ شروع ہو گیا۔

سب سے پہلے مرزا کریم الدین، رسا، آئے۔ یہ سلاطین زادے ہیں۔ کوئی ستر برس کے پیٹے میں ہیں، استعدادِ علمی تو کم ہے مگر شاعری میں اپنے برابر کسی کو نہیں سمجھتے، بہت رحم دل، خوش خلق اور سادہ مزاج ہیں۔ وغلہ فصل

۱۵ بزرگوں کی زبانی دیوان عام کے مشاعروں کا جو حال میں سنا، جو مجلسہ سی پُرس شاعر کا نقشہ عام کیا اور

نام کو نہیں ہے۔ ملاح کہا کرتے ہیں کہ کشتی میں ”چڑھے سب سے پہلے اور اترے سب سے پیچھے“ انھوں نے اس مقولہ کو شاعر سے متعلق کر دیا ہے۔ شاعرے میں سب سے پہلے آتے ہیں اور جب تک ایک کر کے سب نہ چلے جاتے یہ اٹھنے کا نام نہ لیتے۔ ایک روز کا واقعہ ہے کہ مشاعرہ ہو رہا تھا۔ بڑے زور سے ابراہیم سب سے جلدی جلدی مشاعرہ ختم کیا، لوگ اپنے اپنے گھر گئے لیکن یہ ٹھہرے اپنی وضع کے پابند۔ جب تک سب جا چکے اپنی جگہ سے نہ اٹھے۔ ہاں گھڑی گھڑی جھجک جھجک کر آسمان دیکھ لیتے۔ اتنے میں موسلا دھار مینہ برسنا شروع ہوا۔ ایسا برسا ایسا برسا کہ جل بھل بھرنے لگے۔ کہیں دو گھنٹے کے بعد خدا خدا کر کے ذرا مینہ بھتا، تو یہ بھی اٹھے مگر ایسا اندھیرا گھپ تھا کہ ہاتھ کو ہاتھ نہیں سوچتا تھا۔ مالک مکان نے ایک نوکر کو قندیل دے کر ساتھ کر دیا۔ گلیوں میں ٹخنوں ٹخنوں پانی تھا۔ ان بچارے کے پاؤں میں زرد دوزی کا قیمتی جوتا کچر میں پاؤں رکھیں تو کیسے رکھیں۔ آخر چپکے سے نوکر سے کہا کہ تو اپنا جوتا مجھے دیدے۔ اس کا جوتا کیا تھا لیتے تھے، وہی گھسٹتے ہوئے چلے، اپنا جوتا نفل میں دبا لیا۔ قلعہ پہنچ کر ایک نیا جوتا نوکر کو دیا اور کہا۔ ”میاں تو نے آج میرے ساتھ ایسا احسان کیا ہے کہ تمام عمر نہ بھولوں گا، جب کبھی تجھے کوئی ضرورت ہو تو میرے پاس آجا یا کیجیو“ آگے چل کر اس بد معاش نے ان کو بہت دق کیا اور اس راز کا ڈھنڈورا پیٹ دیا، دوسرے ہر تیسرے چوتھے اُن سے ایک دو روپے مار لاتا، مگر انھوں نے کبھی ”نا“ نہیں کی، جب جاتا کچھ نہ کچھ سلوک ضرور کر دیتے۔

نواب زین العابدین خاں صاحب نے بڑھ کر لب فرش اُن کو لیا اور بوجھا۔ ہیں صاحب عالم! میاں حیا، آپ کے ساتھ نہیں آئے۔ ”مرزا جیم الدین حیا، ان کے بڑے بیٹے ہیں، لیکن تھوڑے دنوں سے باپ بیٹے میں کچھ صفائی

نہیں رہی ہے۔ نواب صاحب کا اتنا کہنا تھا کہ صاحب عالم ناسور کی طرح پھوٹ
 بیسے، کہنے لگے ”نواب! وہ بھلا میرے ساتھ کیوں آتے، جب سے بنارس ہو کر
 آئے ہیں ان کا تو رنگ ہی بدل گیا۔ میں بیچارہ تو کس گنتی میں ہوں وہ کسی کو
 بھی اب خاطر میں نہیں لاتے۔ پالا پوسا، بڑا کیا، پڑھایا، لکھایا، شاعر بنایا، بیٹریں
 لڑانا سکھایا اور تخت کی قسم وہ وہ لٹخے بیٹروں کے بتائے ہیں کہ قلعہ تو قلعہ
 ہندوستان بھر میں کسی فرشتہ خاں کو بھی معلوم نہ ہونگے، اور اب وہی
 صاحبزادے صاحب ہیں کہ استاد ماندا کنار مجھ کو باپ بھی کہتے شرماتے ہیں
 ہاں بھی کیوں نہ ہو، تیرھویں صدی ہے، ان کو بنارس بھی جگہ میں تو مصیبت
 میں آگیا۔ ایک نقصان مایہ، دوسرے شہادت ہمایہ۔ بیٹا ہاتھ سے گیا تو گیا،
 دن رات کی دانتا کلکل اور مول لے لی۔ یہ باتیں کرتے کرتے نواب صاحب
 نے میاں رسا، کو لے جا ایک جگہ بٹھا دیا۔ ابھی ان سے فارغ ہوئے تھے کہ
 کہ شہزادوں کا ایک گروہ حافظ عبدالرحمن احسان کو جھڑپ میں لیے آپہنچا
 بھلا دلی شہر میں کون ہے جو ”حافظ جیو“ کو نہ جانتا ہو، جگت استاد ہیں
 پہلے تو قلعہ کا قلعہ ان کا شاگرد تھا مگر استاد ذوق کے قلعے میں قدم رکھتے
 ہی ان کا زور درا ٹوٹا۔ یہ بھی زمانے کی آنکھیں دیکھے ہوئے تھے اور شاہ
 نصیر سے ٹکر لڑ چکے تھے، اس بڑھاپے میں بھی خم ٹھونک کر سامنے آ گئے،
 اور مرتے دم تک مقابلے سے نہ ہٹنا تھا نہ ہٹے۔ کوئی ۹ برس کی عمر تھی مگر
 دُہری ہونے سے قد کمان بن گیا تھا۔ اپنے زمانے کے بلغم باغور تھے، لیکن
 لے آئے دن کی خانہ جنگیوں نے ہر شہزادے کے دل میں یہ خیال پیدا کر دیا تھا کہ شاید کل میں
 ہی بادشاہ ہو جاؤں! سیلئے قلعہ کے سب لوگ خواہ وہ شہزادے ہوں یا سلاطین زادے ہمیشہ
 تخت کی تاج، کی اور اسی طرح کی تہیں کھا یا کرتے تھے۔

غزل اس کڑا کے سے پڑھتے تھے کہ تمام مشاعرے پر چھا جاتے تھے۔ ان کی اُستادی کا سکہ ایک زمانہ سے تمام دلی پر بٹھیا ہوا تھا۔ پہلے مرزا نیلی کے اُستاد ہوئے، رفتہ رفتہ شاہ عالم بادشاہ غازی نور اللہ مرقدہ تک رسائی ہو گئی، وہ ان کو ”حافظ جیو“ کہتے تھے، اس لیے اس نام سے تمام قلعہ میں مشہور تھے مصرعہ پر مصرعہ لگانے میں کمال تھا اور سند ایسی تڑاخ سے دیتے تھے کہ معترض نہ دیکھتے رہ جاتے تھے۔ ایک روز بادشاہ سلامت نے مصرعہ کہا

صبح بھی بوسہ تو دیتا مجھے اسے ماہ نہیں
 اُنھوں نے فوراً عرض کی:-

نامناسب، میاں وقت سحر گاہ نہیں
 کسی نے ”وقت سحر گاہ“ کی ترکیب پر اعتراض کیا۔ انھوں نے جھٹ صائبکا یہ شعر پڑھا

آدمی پیر چو شد حرص جواں می گردود
 خواب در وقت سحر گاہ گراں می گردود
 اور معترض صاحب اپنا سامنہ لے کر رہ گئے۔

بڑے دُبیلے پتلے آدمی تھے، رنگ بہت کالا تھا، شاہ نصیر نے اسی رنگ کا خاکہ اس طرح اُڑایا ہے۔

اے خالِ بُخِ یار تجھے ٹھیک بناتا
 پر چھوڑ دیا حافظِ ستر آن سمجھ کر

نواب صاحب نے اُن سب کو بھی ہاتھ لیا اور اپنی اپنی جگہ لاکر بٹھایا، ابھی ان کو بٹھانے سے فارغ نہ ہوئے تھے کہ منشی محمد علی، تشنہ چم ننگے نشتے میں چور، جھومتے جھامتے اندر آئے، نوجوان آدمی میں نگہ عجیب حال ہے، کبھی برہنہ پڑے پھرتے ہیں، کبھی کپڑے پہن خاصے بھلے آدمی بن جاتے ہیں

کسی کے شاگرد نہیں اور پھر، سب کے شاگرد ہیں۔ کبھی حکیم آغا جان عیش سے اصلاح لینے لگتے ہیں، کبھی استاد ذوق کے پاس اصلاح کے لیے غزل لے آتے ہیں۔ ذہن بلا کا پایا ہے، لاکھوں شعر زبان کی نوک پر ہیں، شعر حسنا اور یاد دہوا۔ اکثر ایسا بھی ہوا ہے کہ کسی کی غزل سنی اور یاد کر لی، مشاعرے میں خود اپنے نام سے وہ غزل پڑھ ڈالی اور وہ بچار اُسٹھ دیکھتا رہ گیا۔ نواب صاحب آگے بڑھے، پوچھا ”منشی جی یہ کیا رنگ ہے؟“ کہنے لگے ”اصلی رنگ، مشاعرہ کب شروع ہوتا ہے؟“ نواب صاحب نے کہا ”ابھی شروع ہوتا ہے، آپ بیٹھے تو سہی، خیر ایک کونے میں جا کر بیٹھ گئے یہاں عارنا نے اُن پر ایک دو شالہ لاکر ڈال دیا، اُنھوں نے اُٹھا کر پھینک دیا۔ غرض حبطرح ننگے آئے تھے، اُسی طرح بلا تکلف بیٹھے رہے۔ اسکے بعد تو لوگوں کے آنے کا تانا باندھ گیا، جو آتا، اُس کا استقبال نواب صاحب کرتے اور لا لاکر بٹھاتے، حکیم مومن خاں آئے، اُن کے ساتھ آرزوہ، شیفہ، صہبائی اور مولوی مملوک العلّی تھے۔ مولوی صاحب مدرسہ دہلی میں مدرسِ اول ہیں۔ عجیب بالکمال آدمی ہیں۔ مدرسہ میں ان کی ذات بابرکات سے وہ فیض ہوا ہے کہ شاید ہی کسی زمانے میں کسی اُستاد سے ہوا ہو۔ بہت پابندِ شرع ہیں۔ اس لیے خود شعر نہیں کہتے، مگر سمجھتے ایسا ہیں کہ اُن کا کسی شعر کی تعریف کر دیا گویا اُس کو دوام کی سند دیدتا ہے، کوئی بیسال کا سن ہے۔ رہنے والے تو نانو ننے کے ہیں، مگر مدتوں سے دہلی میں آرہے ہیں۔ دن رات پڑھنے پڑھانے سے کام ہے، مشاعروں میں کم جاتے ہیں۔ یہاں شاید مولانا صہبائی ان کو اپنے ساتھ گھسیٹ لائے، تھوڑے ہی دن ہوئے پچار سے پابندیِ شرع اور تقویٰ کی وجہ سے چکر میں آ گئے

تھے۔ ہوا یہ کہ رزیڈنٹ بہادر مدرسہ کے معائنہ کو آئے، اُن کے علم اور رتبے کے خیال سے ہاتھ ملایا۔ جب تک صاحب بہادر وہاں رہے، انھوں نے ہاتھ کو جسم سے اس طرح الگ رکھا جیسے کوئی نجس چیز کو دور رکھتا ہے۔ صاحب کے جاتے ہی بہت احتیاط سے ہاتھ کئی بار دھویا۔ کسی نے جا کر صاحب سے یہ بات لگا دی، اُن کو بہت غصہ آیا کہ ہم نے تو ہاتھ ملا کر اُن کی عزت افزائی کی اُنھوں نے اس طرح ہماری توہین کی۔ غرض بڑی شکل سے یہ معاملہ رنغ و رف ہوا۔

مولوی صاحب میرے بھی استاد تھے۔ میں بھی آگے بڑھا، آداب کیا فرمانے لگے ”میاں کریم الدین! میں تم کو ایسا نہیں سمجھتا تھا۔ تم نے تو دہلی والوں کو بھی مات کر دیا، سبحان اللہ! سبحان اللہ! کیا انتظام ہے۔ دیکھ کر دل خوش ہو گیا، خدا تمہیں اس سے زیادہ حوصلہ دے۔“ میں نے عرض کی ”مولوی صاحب! بھلا میں کیا اور میری بساط کیا، یہ سب کیا دھرانواب زین العابدین خاں کا ہے۔“ فرمانے لگے ”بھئی یہ بھی اچھی ہوئی، وہ کہیں سارا انتظام کریم الدین خاں کا ہے۔ تم کہو کہ نواب صاحب کا ہے، چلو، من ترا حاجی بلویم تو مرا حاجی بلو۔“ ابھی یہ باتیں ہو ہی رہی تھیں کہ مرزا نوشہ پالکی میں سے اترے۔ تیر، علائی سا لک اور حزمین اُن کے ہمراہ تھے۔ مرزا غالب آتے ہی مومن خاں کی طرف بڑھے، مصافحہ کیا اور کہا ”بھئی حکیم صاحب آج محمد ناصر جان مخزون کا عظیم آباد سے خط آیا تھا، تم کو بہت بہت سلام لکھا ہے، معلوم نہیں کہ کیوں ایک ایک پٹنہ چلے گئے۔ خواجہ میر درد کے پوتے ہو کر اُن کا دہلی کو چھوڑنا ہلکو تو پسند نہیں آیا، اب یاروں کو روتے ہیں، دیکھنا کیا درد بھرا شعر لکھا ہے

لے اس واقعہ کا ذکر ڈاکٹر ذیاب احمد مرحوم نے ابن الوقت میں کیا ہے مگر نام نہیں لکھا۔ مجھے یقین ہے اُن ہی کی زبان سے یہ معلوم ہوا۔ اب اس کے تعجب ہوا تھا۔ اب ایسے بہت سے لوگوں کو خود اپنی آنکھ سے دیکھ لیا۔

نہ تو نامہ سر ہی نہ پیغام زبانی آیا
اُہ محزون مجھے یا ران وطن بھول گئے

ارے بھی رات تو خاصی اُگئی ہے، ابھی تک میاں ابراہیم نہیں آئے
آخر یہ مشاعرہ شروع کب ہو گا۔ حکیم صاحب کچھ جواب دینے ہی والے تھے
کہ دروازے کے پاس سے ”السلام علیکم“ کی آواز آئی۔ مولانا صاحبائی نے
کہا ”اے لیجئے مرزا صاحب وہ استاد کے نشان کے ہاتھی حافظہ دیران صاحب
آگئے اور وہ آپ کے دوست ہُد بھی ساتھ ہیں، دیکھیے آج کس کے چونچ
مارتے ہیں۔“ میاں ہُد کا نام عبدالرحمن ہے، پورب کے رہنے والے ہیں،
دہلی میں آکر حکیم آغا جان عیش کے ہاں ٹھہر گئے ہیں، اُن کے بچوں کو بڑھاتے
ہیں۔ حکیم صاحب ہی کے مشورے سے ہُد تخلص اختیار کیا۔ اُنہی کی تجویز
سے چکی واڑھی رکھی۔ سر مُنڈا کر لکھو عامہ باندھا اور اس طرح خاصے کھٹک
بڑھی ہو گئے۔ اُنہی کے ذریعے سے دربار میں پہنچے اور طائرالاراکین، شہر
الملک، ہُد الشعرار، منتہا جنگ بہادر خطاب پایا۔ شروع شروع میں تو
اُن کے ظریفانہ کلام سے مشاعرہ چمک جاتا تھا، مگر بعد میں اُنھوں نے اُستادان
فن پر حملے شروع کر دیئے۔ کہتے تو یہ ہیں کہ حکیم صاحب کے اشارے سے
ایسا کیا، لیکن کچھ بھی ہو، آخر آخر سب کو اُن سے کچھ نفرت سی ہو گئی اور بجائے
دوسروں کا مذاق اُڑانے کے خود اُن کا مذاق اُڑ جاتا تھا۔ حکیم صاحب تو
علانیہ اُن کی مدد کر نہیں سکتے تھے خود اُن میں اتنی قابلیت نہ تھی جو دلی والوں
کی پھبتیوں کو سنبھال سکتے، تھوڑی ہی دیر میں ٹھنڈے ہو کر رہ جاتے۔
مہذ انوشہ اور حکیم مومن خاں کے ہمیشہ مُنہ آتے تھے۔ اسی لیے مولانا صاحبائی
کے مُنہ سے ”آپ کے دوست“ کا لفظ سن کر مرزا انوشہ مسکرائے اور کہا

بھئی میں تو ان کے منہ کیوں لگے لگا مگر آج دیکھا جائے گا۔" ہر فرعون نے راموہی "سنتا ہوں کہ ہمارے میر صاحب مولوی قہرمد کی شان میں آج کچھ فرمانے والے ہیں۔ ان کے سامنے اگر یہ شہباز سخن شک گئے تو میں سمجھوں گا کہ بڑا کام کیا۔" عرض یہ باتیں ہو رہی تھیں کہ استاد ذوق بھی اندر آ گئے۔ تمام قلعہ ان کے ساتھ الٹ آیا تھا۔ صاحب سلامت کر کے سب اپنی اپنی جگہ بیٹھ گئے قلعہ والوں اور ان لوگوں میں جن کا تعلق قلعہ سے ہے سلام کرنے کا کچھ عجیب طریقہ ہے سیدھے کھڑے ہو کر دایاں ہاتھ اس طرح کان تک لے جاتے ہیں جیسے کوئی نماز کی نیت باندھتا ہے اور پھر چھوڑ دیتے ہیں، چلو سلام ہو گیا، باقی سب لوگوں سے معمولی طرح سلام کرتے ہیں۔ قلعہ والوں کی صورت کچھ ایسی ہے کہ ایک ہی نظر میں پہچان لینے جاتے ہیں۔ شہزادے ہوں یا سلاطین زادے سب کی وضع قطع ایک سی ہے۔ وہی لمبی گردن، وہی پتلی اونچی ناک، لمبا کتانی چہرہ بڑی بڑی لمبوتری آنکھیں، بڑا دمانہ، اونچا چوکا، آنکھوں کے نیچے کی ابھری ہوئی ہڈیاں، گہرا سونلارنگ، ڈاڑھی کلوں پر ہلکی، ٹھوڑی پر زیادہ۔ عرض جیسی مشابہت ان لوگوں میں ہے، شاید ہی کسی خاندان والوں میں ہوگی۔ امیر تیمور سے لگا کر اس وقت تک انکی شکل میں کوئی فرق نہیں آیا ہے۔ پہلے تو قلعہ بھر کا ایک ہی لباس تھا لہ گلاب کچھ درزنگی ہو گئی ہے۔ وجہ یہ ہوئی کہ جب سے سلیمان

سلسلہ اس مضمون میں جا بجا دہلی والوں کے لباس کا ذکر آیا ہے، مناسب معلوم ہوتا ہے کہ ذرا وضاحت سے اس لباس کو بتا دوں تاکہ پڑھنے والوں کی آنکھوں کے سامنے اس محفل کا نقشہ اور اچھی طرح پھر جائے۔ مرزا نوشہ کا تو ذکر جانے ہی دو وہ تو ڈیرہ اینٹ کی مسجد الگ بناتے ہیں، ان کی ٹوپی دنیا بھر سے جدا تھی۔ نہ ترکی تھی، نہ تاتاری، کھالی کو (خواہ وہ سمور ہو یا برہ) اس طرح نکلیا جاتا تھا کہ نیچے کا گھیراؤ پر کے چند لمبے سے (بقیہ صفحہ ۴۳)

شکوہ کا ادودھ کے دربار میں رسوخ ہوا خاندان کے کچھ لوگ تو وہیں جا رہے ہیں اور کچھ ایسے ہیں کہ بنارس آتے جاتے رہتے ہیں۔ جو وہاں جا کر آتا ہے لباس میں نئی تراش خراش کرتا ہے، اس کا لباس آدھا تیترا آدھا بیڑہ نہ لکھنؤ کا رہتا ہے نہ دہلی کا۔ اب جو لوگ یہاں بیٹھے ہیں انہی کو دیکھ لیجئے۔

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۴۲)

ذرا بڑا ہے۔ اسکے بعد چار کنگرے قائم کر کے کمال کو ٹوپی کی آدمی لبان تک اس طرح رکھ لیا کہ ٹوپی گڑبگڑ کی شکل بن گئی۔ سچ میں چندے کی جگہ نخل یا گمرے رنگ کی بانات کنگروں کے کناروں سے ملا کر سی، اندر استروے دیا۔ چلو مرزا نوشہ کی ٹوپی ہو گئی۔ شہر میں کلاہ تتری کا بہت استعمال ہے جسکو عام اصطلاح میں چوکوشیہ ٹوپی کہتے ہیں۔ یہ بھی کئی طرح کی ہوتی ہیں اور کئی طرح پہنی جاتی ہیں۔ جو ٹوپی شرفا استعمال کرتے ہیں اسکا وہ (گوٹ) ذرا نیچا ہوتا ہے۔ دے کے اوپر چار پاکے کی وضع بالکل شاہجہانی محراب کی سی ہوتی ہے چاروں کو اس طرح ملا کر سیتے ہیں کہ چاروں کو نے مکر (دکرخ) کے نمونے کے ہو جائیں۔ بعض لوگوں نے اس میں ذرا جدت بھی کی ہے، وہ یہ کہ دے کو ادبچا کر کے پاکھوں کی لبان کو چڑان سے کسی قدر بڑھا دیا ہے اور ان کے سلجھانے کے بعد جو پہل پیدا ہوئے ہیں ان کو پھر کاٹ کر کلیاں ڈال دی ہیں، اس طرح بجائے چار پہل کی ٹوپی کے آٹھ پہل ہو گئے ہیں خوبصورتی کے لئے دے کے کناروں پر پتیلی لیس اور گوشوں کے کناروں پر باریک قیطون لگاتے ہیں۔ بادشاہ سلامت کی ٹوپی ہوتی تو اسی نمونے کی ہے مگر سلسے ستارے کے کام سے پس ہوئی اور جابجا موتی اور نگینے ٹکے ہوئے۔ اس قسم کی ٹوپی کئی طرح پہنی جاتی تھی۔ قلعہ و اسے تو پاکھوں کو کھڑا رکھتے ہیں، باقی لوگ ان کو کسی قدر دبا لیتے ہیں۔ جو ٹوپی آٹھ پہل کی ہوتی ہے اسکے پاکھوں کو تو اتنا دباتے ہیں کہ گوشے دے کے باہر پھیل کر کنول کی شکل بن جاتے ہیں۔ اس قسم کی ٹوپی ہمیشہ آدی پہنی جاتی ہے اور وہ بھی اس طرح کلاس کا ایک نمونہ

جوشا ہزار دے لکھنؤ جا کر آئے ہیں اُن کے سر پر لکھنؤ کی دو پلڑی ٹوپی ہے، اونچی چولی کا انگرکھا ہے، نیچے باریک شرتی ملل کا کُرتہ اور تنگ پیجامہ ہے جنھوں نے قلعہ کبھی نہیں چھوڑا اُن کے جسم پر وہی پُرانا لباس ہے۔ سر پر چوگوشیہ ٹوپی، جسم پر نیچی چولی کا انگرکھا، اس کے اوپر مغل یا جامدہ وار کی

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۴۳)

بائیں بھوں کو دبائے۔ اس ٹوپی کے علاوہ ارخ چین (عرق چین) ٹوپی کا بھی بہت رواج ہے اس کا بنانا کچھ مشکل کام نہیں۔ ایک مستطیل کپڑے کے کناروں کو سر کی ناپ کے برابر سی لیا، نیچے پتلی سی گوٹ دیدی اور اوپر کے حصے میں چٹٹ دیکر چھوٹا سا گول گتہ لگا دیا۔ دہلی کی دو پلڑی ٹوپی اور لکھنؤ کی ٹوپی میں صرف یہ فرق ہے کہ یہاں یہ ٹوپی اتنی بڑی بناتے تھے کہ سر پر منڈھ جائے، برخلاف اسکے لکھنؤ کی ٹوپی صرف بالوں پر دھری رہتی ہے۔ ان ٹوپوں کے علاوہ بعض بعض لوگ پنج گوشہ ٹوپی بھی پہنتے ہیں، اس ٹوپی میں پانچ گوشے ہوتے ہیں لیکن اسکی کاٹ چوگوشیہ ٹوپی سے ذرا مختلف ہے۔ گوشوں کے اوپر کے حصے بس ایسے ہوتے ہیں جیسے نقیل کے ٹنگرے۔ نیچے دے کی بجائے پتلی سی گوٹ ہوتی ہے۔ یہ ٹوپی قالب چٹھا کر بنی جاتی ہے، قالب چڑھ کر ایسی معلوم ہوتی ہے جیسے ہمایوں کے مقبرے کا گنبد۔ عام لوگوں میں بڑے گول چند دے کی ٹوپی کا بھی بہت استعمال تھا۔ بعض تو بالکل سادی ہوتی ہے اور بعض سوزنی کے کام یا منیٹے کے کام کی ہوتی ہیں۔ اس ٹوپی کو بھی قالب چٹھا کر پہنتے ہیں۔

لباس میں انگرکھا بہت پسند کیا جاتا ہے۔ دہلی کے انگرکے کی چولی اتنی نیچی ہوتی ہے کہ نات تاک آتی ہے۔ چونکہ ہر شخص کو کسرت کا شوق ہے اس لیے جسم کی خوبصورتی دکھانے کے لیے آستینیں بہت چست رکھتے ہیں اور بعض شوقین آستینوں کو آگے سے کاٹ کر اٹ لیتے ہیں۔ انگرکے کے نیچے کُرتہ بہت کم لوگ پہنتے ہیں۔ قلعے والوں کے انگرکے

خفتان، پاؤں میں گلابی یا غلطے کا ایک برس کا پیجامہ۔ جو لوگ لکھنؤ ہو آئے ہیں انھوں نے دہلی کے لباس کے ساتھ دائری کو بھی خضر باد کھد یا ہے، چہرے کی ساخت سے اُن کو دہلی کا شہزادہ کھد و لو کھد و مگر لباس اور وضع قطع سے تو یہ ٹھیک لکھنؤ والے معلوم ہوتے ہیں۔

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۴۴)

کے اوپر جامہ دار یا نخل کی خفتان ہوتی ہے، بہت تکلف کیا تو اس کے حاشیوں پر پٹ لگا لیا۔ نہیں تو عموماً پتیلی لیس لگاتے ہیں۔ بٹنوں کی بجائے صرف ایک ٹکڑا اور گھنڈی ہوتی ہے جسکو ”عاشق معشوق یا چشے“ کہتے ہیں، اسکی آستینیں ہمیشہ آدھی ہوتی ہیں۔ قطعے میں تو اسکو خفتان کہا جاتا ہے، مگر شہر والے اس سینہ کھلے نیمہ آستین کو ”شیروائی“ کہتے ہیں۔ انگریزوں کے اوپر چوکور شالی رومال سموہ کر کے پیٹھ پر ڈال لیتے ہیں۔ اس رومال کو عام اصطلاح میں ”ارخ چین“ (عرق چین) کہتے ہیں۔ کمر میں بھی تہی کر کے رومال لپیٹنے کا رواج ہے مگر بہت کم۔ پانچا ہمیشہ قیمتی کپڑے کا ہوتا ہے۔ اکثر گلابی، غلطے، مشرعی موٹرے، اطلس یا گورنٹ کا ہوتا ہے۔ پُرانی وضع کے جو لوگ ہیں وہ تو اب بھی ایک برہی کا پانچا پہنتے ہیں، مگر تنگ مہربوں کے پانچا بے بھی چل نکلتے ہیں۔ سلیم شاہی جوئی کا استعمال شروع ہو گیا ہے۔ پھر بھی دہلی کے شرفا گھیتلی جوئی زیادہ پسند کرتے ہیں شاید ہی شہر میں کوئی ہوگا جسکے ہاتھ میں بانس کی لکڑی اور گز بھر لٹھے کا چوکور رومال نہ ہو۔ ڈھونڈ، ڈھونڈ کر لمبی پور کا ٹھوس بھاری بانس لیتے، تیل پلاتے، میندی ملکر باورچی خانہ میں لٹکاتے، یہاں تک کہ اسکی رنگت بدلتے بدلتے سیاہ ہو جاتی اور روزن تو ایسا ہو جاتا تو بیا سیسہ پلا دیا ہے۔ جو نکلتا ہوا اینٹھتا ہوا نکلتا ہے، جسکو کچھ چوڑا سینہ، پتلی کمر، بے ہونے ڈنڈ، شرفا میں تو شاید ڈھونڈ سے ایک بھی ذکلیگا جسکو کٹر کا شوق نہ اور بانک، بنٹ اھ لکڑی نہ جانتا ہو، بچپن ہی سے ان فنون کی تعلیم دی جاتی ہے، مقابلے ہوتے ہیں، ہا ہا ہا سے بچوں اور جوانوں کا دل بڑھاتے ہیں اور فنون سپاہ گری کو شرافت کا تمغہ سمجھتے ہیں۔

استاد ذوق سب مل ملا کر شامیانے کے دائیں طرف بیٹھ گئے، مشاعرے میں شعر اکو سلسلے سے بٹھانا بھی ایک فن ہے۔ نواب زین العابدین خاں کی تعریف کروں گا کہ جبکہ جہاں چاہا بٹھا دیا اور پھر اس طرح کہ کسی کو نہ کوئی شکوہ ہوا نہ شکایت۔ اگر کوئی ایسی جگہ بیٹھ جاتا جہاں اُن کے خیال میں اسکو نہ بیٹھنا چاہیئے تھا تو بجائے اسکے کہ اُس کو وہاں سے اُٹھاتے خود ایسی جگہ جا بیٹھتے جہاں اُسکو بٹھانا چاہتے، تھوڑی دیر کے بعد کہتے ”ارے بھی ذرا ایک بات تو سننا“ وہ اگر اُن کے پاس پاس بیٹھ جاتا، اس سے باتیں کرتے رہتے، اتنے میں کوئی ایسا شخص آجاتا جبکہ وہ خالی جگہ کے موزوں سمجھتے اُس سے کہتے ”تشریف رکھیے وہ جگہ خالی ہے“ جب وہ جگہ بھر جاتی تو کسی بہانے سے اُٹھ جاتے اور اس طرح دو نشستوں کا انتظام ہو جاتا۔ شہزادوں کا سلسلے سے بٹھانا ذرا ٹیڑھی کھیر ہے۔ ذرا ذرا سی بات پر بگڑ کر اُٹھ جاتے ہیں کہ واہ ہم اور یہاں بیٹھیں۔ پھر لاکھ منائیے وہ بھلا کیا ماننے والے ہیں۔ ان جھگڑوں کو استاد ذوق خوب سمجھتے تھے اس لیے اپنے ساتھ والوں کا انتظام اُنھوں نے خود کر لیا، مگر اس طرح کہ کسی کو یہ خیال ہی نہیں ہو کہ یہ محفل کا بندوبست کر رہے ہیں۔ کسی سے کہیں ”صاحب عالم ادھر آئیے“ کسی سے، کسی خاص جگہ کی طرف اشارہ کرتے، کہتے ”بیٹھو، بیٹھو، غرض تھوڑی دیر میں پوری مجلس جم گئی نشست کا یہ انتظام تھا کہ میرزا شاعرہ کے دائیں جانب وہ لوگ تھے جن کا تعلق قلعے سے تھا اور بائیں طرف شہر کے دوسرے استاد اور اُن کے شاگرد۔ ایک چیز جو مجھے عجیب معلوم ہوئی وہ یہ تھی کہ قلعے والے جتنے آئے تھے، سب کے ہاتھوں میں بٹیریں دہنی ہوئی تھیں۔ یہ بٹیر بازی اور مرغ بازی کا مرنہ قلعہ میں بہت ہے۔ روزانہ تیتروں بٹیروں اور مرغوں کی پالیاں ہوتی ہیں۔ ایک شہزادے صاحب نے تو کمال کیا ہے۔ ایک بٹے جھکڑے پر بٹھا ٹھہر

لگا کر چھوٹا سا گھر بنالیا ہے اور اوپر چھت پر مٹی ڈال کر کنگنی بودی ہے۔ ٹھاٹھ میں خدا جھوٹ نہ بلائے تو لاکھوں ہی پڑیاں جہاں چاہا چھکڑا لے گئے اور پڑیاں اڑا دیں۔ ایسی سدھی ہوئی ہیں کہ جھکڑے ایک بھی پھٹ کر نہیں جاتی۔ انھوں نے جھنڈی ہلائی اور وہ اڑیں، انھوں نے آواز دی اور وہ آکر چھت پر بیٹھ گئیں۔

استاد ذوق کو آئے ہوئی چند ہی منٹ ہوئے ہونگے کہ مرزا فتح الملک ہوا دار میں سوار آ پہنچے۔ ان کے ساتھ نواب مرزا خاں داغ تھے۔ میاں داغ کی کوئی سولہ سترہ برس کی عمر ہوگی۔ رنگت تو بہت کالی ہے مگر چہرہ پر غضب کی نہ ماہٹ ہے۔ بڑی بڑی غلافی آنکھیں، ستواں ناک، کشادہ پیشانی، سر پر سیاہ نخل کی لیس لگی ہوئی، چوگوشیہ ٹوپی جسم میں سانلیٹ کا انگڑکھا، سبز گلابی کلبیجامہ، ہاتھ میں ریشمی رومال۔ ہیں تو ابھی نو عمر مگر شعرا ایسا کہتے ہیں کہ سبحان اللہ۔ شہر بھر میں ان کی غزلیں گائی جاتی ہیں غرض ہوا دار فرش سے ملا کر لگا دیا گیا۔ پہلے میاں داغ اترے اور اتر کر امی طرف کھڑے ہو گئے۔ ان کے بعد مرزا فتح الملک اترے، ان کا نیچے قدم رکھنا تھا کہ سب سرود کھڑے ہو گئے۔ چار چوہدار سبز کھڑکی دار پگڑیاں باندھے، نیچی نیچی سبز بانات کی چکنیں پہنے، سرخ شالی رومال کمر سے لپیٹے، ہاتھوں میں گنگا جمینی عصا اور مور جھل لیے ہوا دار کے پیچھے تھے۔ ادھر مرزا فخر نے فرش پر قدم رکھا ادھر عصا بردار توران کے سامنے آ گئے اور مور جھل بردار پیچھے ہو لیے

لے مرزا فخر کے ساتھ نواب مرزا خاں داغ کے آنے کی وجہ تھی کہ نواب شمس الدین خاں کے بھائی پائے کے بعد ان کی بیوی یعنی داغ کی والدہ کا نکاح مرزا فخر سے ہو گیا تھا اور اسی نسبت سے داغ قلعہ میں رہتے تھے (نواب فتح الملک کا عرف مرزا فخر تھا)

اس سلسلے میں یہ جلوس آہستہ آہستہ شامیائے تک آیا۔ مرزا فخر نے شامیائے کے قریب کھڑے ہو کر سب کا سلام لیا۔ پھر چاروں طرف نظر ڈال کر کہا: "اجازت ہے؟" سب نے کہا "بسم اللہ، بسم اللہ" اجازت پا کر یہ شامیائے میں گئے اور سب کو سلام کر کے بیٹھ گئے۔ دوسرے سب لوگ بیٹھنے کی اجازت کے انتظار میں کھڑے تھے۔ ان سب کی طرف نظر ڈال کر کہا "تشریف رکھیے، تشریف رکھیے" سب لوگ سلام کر کے اپنی اپنی جگہ بیٹھ گئے۔ اُستاد ذوق نے داغ کو اپنے قریب ہی ایک جگہ بیٹھنے کا اشارہ کیا، وہ وہاں جا بیٹھے۔ مورچھل بردار شامیائے کے پیچھے اور عصا بردار سامنے کی صف کی پشت پر جا کھڑے ہوئے۔ جب یہ سب انتظام ہو گیا تو نواب زین العابدین خاں آگے بڑھے، شامیائے کے پاس جا کر تسلیات بجالائے اور دو زانو ہو کر وہیں بیٹھ گئے۔ چپکے چپکے صاحب عالم سے کچھ باتیں کیں اور پھر اُٹھ کر اپنی جگہ جا بیٹھے۔ اُن کے اُٹھ کر چلے جانے کے بعد نواب فتح الملک نے دونوں ہاتھ فاتحہ کو اٹھائے۔ ساتھ ہی اہل مجلس نے ہاتھ اٹھائے۔ فاتحہ خیر کے بعد صاحب عالم نے فرمایا "اے خوشنویانِ چین دہلی! میری کیا بساط ہے جو آپ جیسے اُستادِ ان فن کے ہوتے ہوئے میرا مشاعرہ بننے کا خیال بھی دل میں لاسکوں، صرف حضرت پیر و مرشد کے فرمان کی تعمیل میں حاضر خدمت ہو گیا ہوں، ورنہ کہاں میں اور کہاں ایسے بڑے مشاعرے کی میر مجلسی۔ محبوں! اس مشاعرے کی ایک خصوصیت تو آپ کو معلوم ہے کہ اس کے لئے کوئی "طرح" نہیں دی گئی۔ اس کی دوسری خصوصیت آپ یہ پائیں گے کہ بجائے ایک شمع کے دو شمعیں گردش کریں گی۔ جب طرح "طرح" کے لئے نوبت فتح الملک بڑے کئے مسلمان تھے، کوئی کام بغیر فاتحہ خیر کے شروع نہ کرتے اسی لئے سب قلع والے اُن کو "ملا" یا "ملیٹ" کہا کرتے تھے۔

مکمل جانے لے ایک دوسرے کے مقابلے میں فخر و مباهات کا دروازہ بند کر دیا ہے، اُسی طرح دشمنوں کی وجہ سے پڑھنے میں تقدیم و تاخیر کے جو خیالات طبیعتوں کو ملکر رکرتے تھے وہ بھی رفع ہو جائینگے۔ مشاعرے کی ابتدا کرنے اور ختم کرنے کا خیال بھی اکثر دلوں میں فرق ڈالتا ہے، لیکن اس مشاعرے میں، میں نے انتہا کو ابتدا کر دیا ہے۔ چنانچہ حضرت نعل سبجانی کے کلام معجز نظام سے مشاعرے کی ابتدا ہوگی اور اسکے بعد ہی میں اپنی غزل عرض کر کے ابتدا اور انتہا کے فرق کو مٹا دوں گا۔ یہ مکمل مرزا فخر و نے ہاتھ کا اشارہ کیا۔ دونوں چوہدریوں نے کھڑے تھے دونوں شمعیں اٹھا کر ان کے سامنے لائے۔ انھوں نے بسم اللہ لکھ کر فانوس اُتارے اور شمعیں جلا کر فانوس چڑھا دیے۔ چوہدریوں نے شمعیں لیجا کر لگنوں میں رکھ دیں اور سیدھے کھڑے ہو کر مرزا فخر و کی طرف دیکھا۔ انھوں نے گروں سے اشارہ کیا۔ اشارہ پاتے ہی دونوں چوہدریوں نے باؤز بلند کر کے ”حضرات! مشاعرہ شروع ہوتا ہے“

اس آواز کا سننا تھا کہ ایک سناٹا ہو گیا۔ قلعہ والوں نے بیڑیں تھیلیوں میں بند کر کے تکیوں کے پیچھے رکھ دیں۔ نوکروں نے جھٹ پٹ حقے سامنے سے ہٹا دیے اور ان کی جگہ سب کے سامنے آگلا دان، خامدان اور بھن دھینے کی طشتیاں رکھ اپنی اپنی جگہ جا کھڑے ہوئے۔ اتنے میں بارگاہ جہاں پناہی کا خواہی بادشاہ سلامت کی غزل لیے ہوئے قلعے سے آیا۔ اسکے ساتھ کئی نقیب تھے وہ خود شمع کے قریب آ کر تسلیات بجالایا اور غزل پڑھنے کی اجازت چاہی۔ مرزا فخر و نے گروں کے اشارے سے اجازت دی، وہ وہیں بیٹھ گیا۔ نقیبوں نے آواز لگائی ”حاضرین! حضرت نعل سبجانی، صاحب قرآن ثانی خلد اللہ علیہ و سلطنتہ کا کلام معجز نظام پڑھا جاتا ہے۔ نہایت ادب کے ساتھ گوش دل سے سماعت فرمایا جا“

تمکمل

حضورِ شاہ میں اہل سخن کی آزمائش ہو

چمن میں خوشنویانِ چمن کی آزمائش ہو

نقیب کی آواز کے ساتھ ہی سب اہل محفل دوزانو ہو سنبھل کر بیٹھ گئے

اور پاسِ ادب سے سب نے گہروں میں جھکالیں۔ خواہی نے بادشاہ سلامت

کی غزل خریطے میں سے نکالی، پسہ دیا، آنکھوں سے لگایا اور بلند آواز سے

سورٹھ کے سُروں میں پڑھنا شروع کیا۔ الفاظ کی نشست، زبان کی خوبی، مضمون

کی آمد اور سب سے زیادہ پڑھنے والے کے گلے نے ایک سماں باندھ دیا، ایک کیفیت

بکھری کہ زمین سے آسمان تک چھائی ہوئی تھی، کسی کو تعریف کرنے کا بھی ہوش نہ تھا

اُستادِ ابنِ فن ہر شعر پر جھومتے تھے۔ کبھی کبھی کسی کے مُنہ سے سبحان اللہ سبحان اللہ

کے الفاظ بہت نیچی آواز میں نکل گئے تو نکل گئے ورنہ ساری مجلس پر ایک عالمِ بخودی

طاری تھا۔ مقطع پر تویہ حال ہوا جیسے کسی نے سب پر جادو کر دیا۔ ہر شخص دجہ میں جھوم

رہا تھا، باصرار تمام کئی کئی دفعہ مقطع پڑھوایا اور مضمون اور زبان کی چاشنی کا

لطف اُٹھایا۔ لیجئے آپ بھی پڑھیے اور زبان کے مزے لیجئے۔

نہیں عشق میں اس کا تو بچ نہیں کہ قرارِ دشکیبِ دُرا نہ رہا

غمِ عشق تو اپنا رفیق رہا۔ کوئی اور بلا سے رہا نہ رہا

نہ بکھی حال کی جب ہمیں اپنی خبر رہے دیکھتے اوروں کے عجب ہنر

بڑی اپنی بُرائیوں پر جو نظر۔ تو نگاہ میں کوئی بُرا نہ رہا

ہمیں ساغرِ بادہ کے دینے میں اب کرے دیر جو ساقی تو ہائے غضب
 کہ یہ عہدِ نشاط، یہ دورِ طرب نہ رہے گا جہاں میں سدا نہ رہا
 لگے یوں تو ہزاروں ہی تیرِ ستم کہ ٹپتے رہے پڑے خاک پہ ہم
 دے نازد کر شمع کی تیخِ دو دم لگی ایسی کہ تسمہ لگانا نہ رہا
 ظفر آدمی اُس کو نہ جانئے گا ہو وہ کیسا ہی صاحبِ فہم و ذکا
 جسے عیش میں یادِ حسد نہ رہی جسے طیش میں خوفِ خدا نہ رہا
 غزل پڑھ چکنے کے بعد خواص نے کاغذِ مرزا فخر کے ہاتھ میں دیا۔
 زرافشاں، کاغذِ پرخو و حضرتِ ظل اللہ کے قلم کی لکھی ہوئی غزل تھی، خط
 ایسا پاکیزہ تھا کہ آنکھوں میں کھٹا جاتا تھا۔ مرزا فخر نے کاغذ لیکر ادھر
 اُدھر دیکھا، ملوکِ اعلیٰ نے سینے پر ہاتھ رکھ کر کہا "صاحبِ عالم! ہمارا
 کیا منہ ہے جو ہم حضرتِ ظل سبحانی کی غزل کی جیسی چاہتے ویسی تو دینا کر سکیں
 البتہ ان نوازشات شاہی کا شکریہ ادا کرتے ہیں جو حضرت پیر و مرشد نے
 غزل بھیج کر شرکائے مشاعرہ پر مبذول فرمائی ہیں۔ بارگاہِ جہاں پناہی میں
 ہمارا ناچیز شکریہ پیش کر کے ہماری عزت افزائی فرمائی جائے۔" مرزا فخر
 نے خواص کی طرف دیکھا۔ اُس نے عرض کی "قبلہ عالم! میں یہ پیام جاتے ہی
 پیشگاہِ عالی میں پہنچا دوں گا۔" خواص آداب کر کے جانے والا ہی تھا کہ مرزا
 فخر نے روکا اور کہا "جانے سے پہلے صاحبِ عالم و عالمیان حضرت
 ولی عہد بہادر کی غزل بھی پڑھتے جاؤ۔ چلتے چلتے مجھے عنایت کی تھی اور
 فرمایا تھا کہ کسی خوش گلو شخص سے پڑھوانا۔ بھلا تم سے زیادہ موزوں اور کون
 شخص مل سکتا ہے۔" یہ کہہ کر جیب میں ہاتھ ڈالا اور ایک کاغذ نکال کر خواص
 کو دیا۔ اُس نے آداب کر کے کاغذ لیا اور وہیں بیٹھ کر یہ غزل مسنائی :-

دل سے لطف و مہربانی اور ہے مہربانی کی نشانی اور ہے
قصہ فرما دو مجنوں اور ہے عشق کی میرے کہانی اور ہے
روکنے سے کب مرے کہتے ہیں شک بلکہ ہوتی خوں نشانی اور ہے
ہم سے اے دارادہ کہتے ہیں اُن کے دل میں بدگمانی اور ہے

غزل تو بہت کھپ چھی تھی مگر ولی عہد بہادر کی غزل تھی، بھلا کس کا جگر اٹھا
جو تعریف نہ کرتا۔ البتہ خائب اور مومن بالکل چپ بیٹھے رہے۔ بعض قلعہ والوں
کو بڑا بھی معلوم ہوا مگر ان دونوں کو خوب سمجھتے تھے کہ یہ سچی تعریف کر نیوالے
لوگ ہیں۔ دلی عہد تو ولی عہد اگر بادشاہ سلامت کی بھی کمزور غزل ہو تو گروت تک
نہ ہلائیں۔ القصد خواہی تو غزل پڑھ حضرت ہوا اور اب حاضرین جلسہ کے
پڑھنے کی نوبت آئی۔

مرزا فخر نے چوبدار کو اشارہ کیا۔ اُس نے دونوں شمعیں لاشامیانے
کے سامنے رکھ دیں۔ صاحب عالم نے اپنی غزل نکالی اور ادھر ادھر نظر ڈالکر
اور گردن کو ذرا جھکا کر کہا ”بھلا میری کیا مجال ہے کہ آپ جیسے کا ملین فن کے
مقابلے میں کچھ پڑھنے کا دعویٰ کروں، البتہ جو کچھ بُرا بھلا کہا ہے وہ بہ نظر
اصلاح عرض کرتا ہوں۔“

- ۱۔ غم وہ کیا ہے جو جاں گزار نہ ہوا دروہ کیا جو لا دوانہ ہوا
- ۲۔ حال کھل جائیں غیر کے سامنے پر کروں کیا کہ تو مرانہ ہوا
- ۳۔ درو کیا جس میں کچھ نہ ہو تاثیر بات کیا جس میں کچھ مزانہ ہوا
- ۴۔ وہ تو ملتا، پڑاے دل کم ظن تجھ کو ملنے کا حوصلہ نہ ہوا
- ۵۔ شکوہ یار اور زبان قریب کھیل ٹھہرا کوئی گلہ نہ ہوا
- ۶۔ تم رہو اور مجمع اغیار میرا کیا ہے، ہوا، ہوا نہ ہوا

۴۔ پھر عھارے ستم اٹھانے کو رمز اچھا ہوا، برا نہ ہوا
 مرزا فخر کی آواز تو اونچی نہ تھی، مگر پڑھنے میں ایسا دروتھا کہ سنکر
 دل بے تاب ہو جاتا تھا۔ سارا مشاعرہ واہ واہ اور سبحان اللہ کے شور سے
 گونج رہا تھا۔ تیسرے شعر پر مرزا غالب نے اور پانچویں پر حکیم مومن خاں
 نے ایسے جوش سے واہ واہ کی کہ صفت سے آگے نکل آئے، مرزا فخر داہنی غزل
 پڑھتے رہے مگر ان دونوں کو ابھی دو شعروں کی رٹ لگی رہی۔ پڑھتے اور مرے
 میں آکر جھومتے۔ جب غزل ختم ہوئی تو مرزا نوشتہ نے کہا ”سبحان اللہ !
 صاحب عالم ! سبحان اللہ۔ واہ کیا کہنا ہے، شعریوں کہتے ہیں، مزہ آگیا۔
 استاد ذوق بھی مسکرائے کہ چلو اسی بہانہ سے میری تعریف ہو رہی ہے۔ مرزا
 فخر نے اٹھ کر سلام کیا اور کہا ”یہ آپ اصحاب کی بزرگانہ شفقت ہے جو اس طرح
 ارشاد ہوتا ہے ورنہ من آغم کہ من داغم“ وہ جدھر نظر ڈالتے لوگ تعریفیں کرتے
 اور وہ جھجک جھجک کر سلام کرتے۔ جب محفل میں فدا سکون ہوا تو مرزا فخر و سنے
 چو بدار کو اشارہ کیا اُس نے شامیہاں کے سامنے سے ایک شمع اٹھا، سامنے کی
 صفت، میں میاں تل کے آگے رکھ دی۔ نام تو اُن کا عبد القادر تھا مگر شہر کا بچہ بچاؤں کا
 میاں تل کہتا تھا۔ اُن کو بھی اپنی طاقت پر اتنا غرور تھا کہ کسی پہلوان کو خاطر میں
 لے اس غرور ہی نے آخر اُن کو نچا دکھایا۔ ان کا روز روز اکھاڑے میں آکر خرم ٹھونکنا لوگوں کو نالوا
 گذرا۔ شیخو والوں کے استاد حاجی علی جان نے ایک چٹھہ تیار کیا، بدن میں تو کچھ ایسا زیادہ تھا
 گردن اُس بیچ میں طاق تھا اور پھرتی اس بلای کی تھی کہ کیا کہوں۔ ایک دن جو میاں تل نے حسب
 معمول شیخوں والوں کے باؤں کو خرم ٹھونکے تو لوند اکبر سے اُٹار پتیر بدل سامنے آگیا اور خرم ٹھونک
 کر ہاتھ ملانا چاہا۔ میاں تل کو ہنسی آگئی کہ بھلا یہ پوڈا میرا کیا مقابلہ کرے گا۔ ہاتھ ملائے میں تامل کیا
 استاد علی جان نے کہا ”کیوں بھی ہاتھ کیوں نہیں ملائے؟ یا تو ہاتھ ملایا پھر کبھی اس لکھاڑے

نہیں لاتے تھے۔ جس اکھاڑے میں جاتے وہاں خم ٹھونک آتے اور کسی کو (بقیہ حاشیہ صفحہ ۵۳) میں اگر خم نہ ٹھونکنا، کہنے لگے استاد! جوڑ تو دیکھ لو، خواہ مخواہ اس نوڈے کو پسوانے سے حاصل؟ ”اُستاد نے کہا ”میاں جو جیسی کر لگا ویسی بھرے گا، دنگل میں تم اسے کچل ڈالنا، یہی ہو گا تاکہ بڑی پسلی تڑا کر آئندہ کو کون ہو جائیے، بہر حال دونوں کے ہاتھ مل گئے اور تاریخ مقرر ہو گئی، اس مشاعرے کے دو چار ہی دن بعد شاہی دنگل میں کشتی قرار پائی۔ عید گاہ کے پاس ہی یہ دنگل ہے، دس پندرہ ہزار آدمیوں کے بیٹھنے کی جگہ ہے مگر اس دن وہاں تل رکھنے کو جگہ نہ تھی۔ جدھر نظر جاتی سر ہی سر دکھائی دیتے۔ میاں یل کی بیہوشیوں کی وجہ سے ساری دہلی اس نوڈے کی طرف تھی، پہلے چوٹی موٹی کشتیاں ہوتی رہیں۔ ٹھیک چار بجے یہ دونوں جا بکے پہن، چادر میں پھینک دنگل میں اُترے۔ اُترتے ہی دونوں نے ”یا علی“ نعرہ مارا۔ دو چار ڈھیکلیاں کھائیں، کچھ پڑھ کر بیٹھی سینے پر ڈالی اور خم ٹھونک آسنے سے آگے۔ دونوں کے جسموں میں زمین آسمان کا فرق تھا، ہاتھی اور چوٹی کا معتدل تھا، تمام دنگل میں سناٹا تھا۔ سوئی بھی گرسے تو آواز سن لو۔ ہاں آواز تھی تو یا علی کی یا خم ٹھونکے کی۔ میاں یل نے نوڈے کا ہاتھ پکڑ جھٹکا دیا۔ وہ آگے کو بھجکا یہ مگر پر آگئے وہ چٹ عوطہ مار ہاتھوں کو چیر نکل گیا۔ انھوں نے۔ انھوں نے اسکا سیدھا ہاتھ پکڑ دھونی پاٹ پر کسنا چاہا، وہ تو ذکر کے الگ جاکھڑا ہوا۔ یہ گاؤں دوری کر کے اُس کو دبا تو لیستے لیکن وہ اپنی بھرتی کی وجہ سے دزاسی دیر میں صاف نکل جاتا۔ آخر ایک دفعہ یہ اسکو دبا ہی بیٹھے وہ چپکا پڑا ہا انھوں نے ہنسنے لگے۔ تھوڑی دیر تک اسکو خوب رگڑا وہ سسے چلا گیا انھوں نے پہلو میں اُسکے اس کا سینہ کھولنا چاہا، وہ بھی موقعہ تاک رہا تھا، یہ کھینچنے میں ذرا غافل ہوئے اُس نے ٹانگ پر باندھ جو اڑایا تو میاں یل چاروں خانے چٹ جا پڑے نوڈا ابکھ سینے پر سوار ہو گیا۔ ”وہ مارا۔ وہ مارا۔“ کی آوازوں سے دنگل ہل گیا۔ لوگوں نے موڑ نوڈے کو گود میں اٹھالیا۔ کسی نے یہ بھی پھر کر نہ دیکھا کہ میاں یل کہاں پڑے ہیں۔ یہ بھی چپکے سے اٹھ چادر اوٹھ سنہ لپیٹ ایسے غائب ہوئے کہ پھر کسی نے ان کی صورت نہ دیکھی۔ دنگل سے کیا گئے ہمیشہ کے لیے دہلی سے گئے۔ تھے بڑے غیر متند وہ دن اور آج کا دن، پھر اُن کی صورت نظر آئی۔ خدا جانے کہاں مر کھ پ گئے۔

جواب میں اُن کے سامنے خم ٹھوکنے کی ہمت نہ ہوتی۔ پہلوانی کی نسبت سے تخلص 'یل' رکھا تھا۔ مضمون بھی زندانِ باندھتے تھے۔ پڑھتے اس طرح تھے کہ گویا میدانِ کارزار میں رجز پڑھ رہے ہیں۔ اس سے غرض نہ تھی کہ کوئی تعریف کرتا ہے یا نہیں کرتا، ان کو اپنے شعر پڑھنے سے کام تھا۔ غزل لکھی تھی:-

کمد و رقیب سے کہ وہ باز آئے جنگ سے ہرگز نہیں ہیں یا ربھی کم اُن ننگ سے
لب کا بڑھا دیا ہے مزارِ خطِ سبز نے ساقی نے پشتِ دی مئے صافی کو ننگ سے
دل اب کے بے طرح سے پھینا زلفِ یار میں نکلے یہ کیونکہ دیکھے قیدِ فرنگ سے
آجائو نہ پیچ میں ظالم کے دیکھنا یاری تو تم نے کی جڑیل اُس شوخ و تنگ سے

اُن کی غزل ختم ہوتے ہی چوہدار نے دوسری شمع اٹھا، مرزا علی بیگ کے سامنے رکھ دی۔ یہ بڑے گورے چٹے نوجوان آدمی ہیں، کسرت کا بھی شوق ہے، نازتینِ تخلص کرتے ہیں۔ دہلی میں بس ہی ایک ریختی گو ہیں۔ ادھر شمع رکھی گئی۔ ادھر نواب زین العابدین خاں نے آواز دی۔ "اوڑھنی لاؤ۔" ایک نوکر فوراً گھر سے سرخ رنگ کی تاروں بھری اوڑھنی لیکر حاضر ہوا۔ نازتین نے لے کر بڑے ناز و انداز سے اُس کو اوڑھا ایک پلو کا بھل ماسا، دوسرا پلو سامنے پھیلا لیا اور خاصی بھلی خنگی عورت معلوم ہونے لگے۔ غزل ایسی لڑ لڑ کر اور اُڑ اُڑ کر پڑھی کہ سارا مشاعرہ عیشِ عیش کرنے لگا۔ نرت ایسا پیارا کرتے تھے کہ کوئی بیسوا بھی کیا کرے گی۔ دوسرا شعر تو اس طرح پڑھا کہ گویا "باجی" کو جاننے کے لیے سب کچھ کرنے کو تیار رہیں۔ قلعے والوں کو تو اس غزل میں بڑا مزہ آیا۔ مگر جو ریختے کے استاد تھے وہ خاموش بیٹھے سنتے رہے۔ غزل یہ تھی:-

ہوئی عشاق میں شہورِ یوسف سا جواں تاکا

بواہم عورتوں میں تھا بڑا دیدہ زلیخا سا

مجھے کہتی ہیں باجی تو نے تاکا چھوٹے دیور کو
نہیں ڈرنے کی میں بھی ہاں، نہیں تاکا تو اتنا کا
اگر اے نازنیں تو دُوبلی تپلی کا سنی سی ہے

چھریرا سا بدن، نام خدا ہے تیرے دولہا کا
اب دونوں شمعیں اس طرح گردش کرنے لگیں کہ پہلے صف کے سیدھی
جانب کا ایک شخص غزل پڑھتا تھا اور پھر اُلٹی طرف کا۔

نازنین کے پڑھنے کے بعد دائیں جانب کی شمع ہٹ کر میاں عاشق
کے سامنے آئی۔ یہ بچارے ایک مزدور پیشہ آدمی ہیں، لکھنا پڑھنا بالکل نہیں
جانتے، نہ کسی کے شاگرد ہیں نہ کسی کے استاد۔ شعر خاصہ اچھا کہتے ہیں۔ اس
مشاعرے میں ایک شعر تو ایسا نکل گیا ہے، کہ سبحان اللہ، لکھا ہے :-

فقط تو ہی نہ میراے بُتِ خونخوار دشمن ہے

ترے کوچے میں اپنا ہرود دیوار دشمن ہے

غزل میں باقی سا بے اشعار تو صرف بھرتی کے تھے مگر اس شعر پر
ہر طرف سے بڑی دیر تک واہ واہ ہوتی رہی۔ ان کے غزل ختم کرنے پر
بائیں طرف کی شمع اُٹھا کر عبد اللہ خاں، اوج کے سامنے رکھ دی گئی۔ یہ بڑے
پُرانے ۴۰، ۵۴ برس کے مشاق شاعر ہیں۔ مضمون کی تلاش میں ہر وقت
سرگرداں رہتے ہیں، لیکن ڈھونڈ ڈھانڈھ کر ایسے بلند مضامین اور نازک
خیالات لاتے ہیں کہ ایک شعر تو کیا ایک قطعے میں بھی اُن کی سما کی شکل
ہے اور کوشش یہ کرتے ہیں کہ ایک ہی شعر میں مضمون کو کھپا دیں، نتیجہ
یہ ہوتا ہے کہ مطلب کچھ کا کچھ ہوتا ہے۔ بھلا درسروں کو تو ان کے شعروں
میں کیا مزا آئے اور کوئی کیا داد دے۔ ہاں یہ خود ہی پڑھتے ہیں، خمیہ ہی

نیچے ایک نقشہ دیتا ہوں اس سے نشست کی کیفیت پڑھنے والوں کا سلسلہ اور مشاعرے کا انتظام اچھی طرح سمجھ میں آ جائیگا

[illegible]

مڑے لیٹے ہیں اور خود ہی اپنی تعریف کر لیتے ہیں۔ غزل اس زور شور سے پڑھتے ہیں کہ زور میں اکرم صفت مجلس سے گزروں آگے نکلیجاتے ہیں۔ ان کے شاگرد تو دو چار ہی ہیں مگر استاد بھی ان کو استاد دمانتے ہیں۔ بھلا کس کا بل بوتہ ہے جو ان کو استاد نہ کہ مکرم صفت کی لڑائی مول لے۔ ادھر انھوں نے شعر پڑھا: ادھر استاد ذوق یا مرزا غالب نے داد دی۔ داد دینے میں ذرا دیر ہوئی اور ان کے تیور بدلے۔ ان کے غصہ کی بھلا کون تاب لا سکتا ہے۔ چارو ناچار تعریف کرنی پڑتی، جب کہیں جا کر یہ ٹھنڈے پڑتے۔ غزل ہونی تھی،

دم کا جو دمدمہ یہ باندھے خیال اپنا بے پل صراط اُتریں، یہ بے کمال اپنا
طفلی ہی سے ہو مہک چوشت سر گرفت سُم میں گڑا ہوا ہے، آہو کے نعل اپنا
کسیب شہادت اپنا ہو یا کس کو قاتل سلچے میں تیغ کے سر لیتے ہوئے حال اپنا
چیچک کے آبلوں کی میں باگ ہو تا ہوا (رکھ کے) دیوی کے آستان پر بیٹھ ل اپنا
آخری شعر پر تو مرزا غالب اُچھل پڑے۔ کہنے لگے ”واہ میاں اوج اس

شعر کے دوسرے مصرعے نے تو غضب ڈھا دیا ہے، بھئی واللہ لفاظ ”رکھ کے“ کیا خوب پھنسا ہے۔ یہ سب کافر ہیں جو تمہیں استاد کہتے ہیں۔ میاں تم تو شعر کے خدا ہو خدا غرض سب استادوں نے تعریفوں کے پل باندھ دیے اور میاں اوج ہیں کہ بچوں کو لڑپٹا ہوئے جاتے ہیں۔ جب ذرا سکون ہوا تو سیدی عرف کی شمع کھسک کر محمد یوسف ”نکلیں“ کے سامنے آئی۔ اُن کی عمر کوئی ۱۶، ۱۵ سال کی ہوگی، مدرسہ دہلی میں طالب علم ہیں۔ غضب کی ظرفیاء طبیعت پائی جو بات کہنے میں منحہ سے پھول جھڑتے ہیں۔ نازک نازک نقشہ، سانولا رنگ بھرے بھرے ہاتھ پاؤں، جوان ہوں گے تو بڑے خوبصورت آدمی نکلیں گے غزل کہی تھی :-

دورخ بھی جس سے مانگتا ہر دم پناہ تھا کس دل چلے کی بار خدایہ آہ تھی
خانہ خراب ہو جو ترا عشق بے حیا آئین کو لٹا تھا کیا رسم و راہ تھی
تو نے جو دل کو میرے صنم خانہ کر دیا رہتا خدا تھا جس میں یہ وہ بارگاہ تھی
تکلیں کو اک نگاہ میں دیوانہ کر دیا جادو فریب آہ یہ کس کی نگاہ تھی
میاں تکلیں کا دل بڑھانے کو سب نے تعریف کی قطعہ کو گئی کئی دفعہ
پڑھوایا۔ اُستاد احسان نے کہا ”میاں یوسف! کیا کہنا ہے، خوب کہتے ہو،
کوشش کیے جاؤ، ایک نہ ایک دن اُستاد ہو جاؤ گے۔ مگر میاں کسی کے شاگرد
ہو جاؤ۔ بے اُستاد رہے تو بھٹک نکلو گے۔“ میاں تکلیں نے مسکرا کر کہا۔
”اُستاد! میں کہیں آپ کے حکم سے باہر ہو سکتا ہوں، کل ہی انشاء اللہ اُستاد
اوج کی خدمت میں حاضر ہو جاتا ہوں۔“ اُستاد ذوق نے کہا ”ہاں بھئی ہاں
خوب انتخاب کیا، بس یہ سمجھو کہ چند ہی دن میں بیڑا پار ہے۔“ یہاں یہ باتیں یہی
کھیں کہ دوسری شمع غلام احمد ’تصویر‘ کے سامنے پہنچ گئی۔ اُن کو میاں بتن
بھی کہتے ہیں، الفت کے نام بے نہیں جانتے، مگر طبیعت غضب کی پانی ہے
پہلے میاں تنویر کے شاگرد تھے، بعد میں اُن سے ٹوٹ کر اُستاد ذوق سے آئے
بھاری بدن، مُنڈی ہوئی ڈاڑھی، چھوٹی چھوٹی موچیں، گہرا سانولازنگ
جسم پرسوسی کا تنگ مہری کا پانچامہ، اوپر سوسی ہی کا کرتہ، کندھے پر لٹھے کا
رومال، سر پر سوزنی کے کام کی گول ٹوپی۔ بچارے نیچے نیابری پر گزراوقات
کرتے ہیں۔ بڑے پُرگو شاعر ہیں، لکھنا پڑھنا تو جانتے ہی نہیں اس لیے جو کچھ
کہتے دل و دماغ ہی میں ٹھونٹتے جاتے ہیں۔ یاد اس بلا کی ہے کہ ذرا چھیر دو
تو ارگن کی طرح بجنے لگتے ہیں اور ختم کرنے کا نام ہی نہیں لیتے، کلام الیا
پاکیزہ ہے کہ بڑے بڑے اُستادوں کے سر ہل جاتے ہیں۔ ان کو سنو تو

یہ معلوم ہی نہیں ہوتا کہ ایک اُمّی پڑھ رہا ہے۔ بس یہ سمجھ لو کہ ”الشعر از تلامیذ الرحمن“ کی بہترین مثال ہیں۔ غزل کہی تھی:-

ہجر کی شب تو سحر ہو یا رب دو نہ آیا تو قیامت ہی تھی

جان بے کار تو اپنی نہ گئی اے سکر تری شہرت ہی تھی

مجھ سے آنا بھی نہ کھینچے صبا آپ پر میری طبیعت ہی تھی

جذبہ دل نہیں لایا تم کو آپ کی غیر عنایت ہی تھی

ہر شعر پر واہ، واہ اور سبحان اللہ کے شور سے محفل گونج جاتی تھی، غزل

تمام ہوئی تو اُستاد و ذوق نے حکیم ہون خاں کی طرف دیکھا کہ کہا: ”خاں صاحب“

یہ میاں بٹن بھی غضب کی طبیعت لیکر آئے ہیں، کہنے کو تو میرے شاگرد ہیں،

گدا بے تک ان کے کسی شعر میں اصلاح دینے کی مجھے تو ضرورت نہیں ہوئی۔ کل

ایک غزل سنائی تھی، میں تو پھر ک گیا۔ ایک شعر تو ایسا بے ساختہ نکل گیا جو

کہ تعریف نہیں ہو سکتی۔ ہاں میاں بٹن وہ کیا شعر تھا؟ میاں بٹن نے ذرا

دماغ پر زور ڈالا اور شعر دماغ سے پھسل زبان پر آ گیا۔ مطلع تھا:-

برہمچری تری نگاہ کی پہلو میں آگئی پہلو سے دل میں، دل سے کلیجہ میں لگی

اور شعر یہ تھا:-

دامن پہ وہ رکھے نہ رکھے دلہا لگی لیکن ہمارا ہی خاک ٹھکانے سے آگئی

حکیم صاحب نے بہت تعریف کی اور کہا: ”میاں بٹن! یہ خدا کی دین

ہے، یہ بات پڑھنے پڑھانے سے پیدا نہیں ہوتی۔ میاں خوش رہو، اسوقت

دل خوش کرو پا“

ان کے بعد شمع محمد جعفر تاجش کے سامنے آئی۔ یہ الہ آباد کے رہنے

والے ہیں بہت دنوں سے دلی میں آرہے ہیں۔ بچا رسے گوشہ نشین آدمی ہیں

شاعری سے دلی لگاؤ ہے، کوئی مشاعرہ نہیں ہوتا جہاں نہ پہنچتے ہوں غزل میں
دو شعر بہت اچھے تھے وہی لکھتا ہوں۔

کبھی بن بادہ رو نہیں سکتے توبہ کچھ ہم کو سازگار نہیں
دل میں خوش ہیں، پراوٹاں وہ ستگر کسی کا یا نہیں

مقطع کی کچھ ایسی پیاری بندش پڑی ہے کہ سب کے منہ سے بے ساختہ واہ واہ
نکلی، مفتی صدر الدین صاحب کی تو یہ حالت تھی کہ پڑھتے تھے اور جھومتے تھے۔

تائبش کے بعد الٹی جانب کی شمع سیاں تعلق کے آگے گئی۔ خدا ان سے محفوظ
رکھے پڑے چالاک آدمی ہیں، عبدالعلی نام ہے، بدر اس کے رہنے والے ہیں
کوئی ۳۰ برس کی عمر ہے پچھن ہی میں گھر سے نکل کھڑے ہوئے، حیدر آباد ہوتے
ہوئے دہلی آئے۔ ہزاروں کو تعویذوں کے جال میں پھنسا کر پڑا کر دیا۔ ان کا
شکل سے لوگ گھبراتے ہیں۔ شاہ صاحب بنے پھرتے ہیں، مگر دل کا خدا
مالک ہے، شعر خاصہ کہتے ہیں، لکھا تھا

خیم شراب سے خیم گرد و آبن گیا ساتی بنا دے ماہ پیالا اچھال کے
ہم مشربوں میں چل کے تعلق میکشی کڑ جھگڑے، ماں نہیں میں حرام حلال کے

یہ پڑھ چکے تو شمع منشی محمود جان آج کے سانسے لگئی، اُن کی غزل میں
دو ہی شعر ایسے تھے جن کی تھوڑی بہت تعریف ہوئی، باقی تو سب بھرتی کے تھے۔

آنے میں اس جان جاں کے دیر ہے کچھ مقدار کا ہمارے پھیر ہے
ہے یقیں وہ جان جاں تا نہیں موت کے آنے میں پھر کیوں دیر ہے

اُن کے بعد مرزا کا مل بیگ کی باری آئی۔ یہ سپاہی پیشہ آدمی ہیں سکال تخلص

۵۰ آئندہ یہ ظاہر کرنے کی ضرورت نہیں کہ سیدھی طرف کی شمع بڑھی یا الٹی جانب سے۔ سمجھ لیجئے
کہ پہلے دائیں طرف کا ایک شاعر چمکتا تھا اور پھر بائیں طرف کا۔

کرتے ہیں۔ مشاعرے میں بھی اوجھی بن کر آئے ہیں۔ غزل اس طرح پڑھی گویا
فوج کی کمان کر رہے ہیں۔ دیکھ لو مصنون میں بھی وہی سپاہیانہ رنگ جھلک رہا
ہے۔ ان کی غزل میں قطعہ بڑے مزے کا تھا وہی لکھتا ہوں:-

مژگاں سے گرجے دل، ابرو دکرے ہے ٹکڑے

یہ بات میں نے لکھا جب اس سے داد چاہی

کہنے لگا کہ ترکش جس وقت ہوئے خالی

تلوار پھر نہ کھینچے تو کیا کرے سپاہی

اب حکیم سید محمد تمشق کے پڑھنے کا منبر آیا۔ یہ بڑے پایہ کے ادیب

ہیں۔ ۶۳، ۶۴ برس کی عمر ہے۔ حکمت میں اپنا جواب نہیں رکھتے۔ غرض کیا

کہوں ایک جامع کمالات شخص ہیں مگر اپنے آپ کو بہت دور کھینچتے ہیں۔ اچھا

شعر سُنتے ہیں تو بیتاب ہو جاتے ہیں، چاہتے ہیں کہ حسبِ طرح میں تعریف کرتا

ہوں۔ دوسرے بھی میرے شعر کی تعریف کریں۔ شعر بُرا نہیں کہتے مگر ایسا بھی

نہیں ہوتا کہ مشاعرہ چمک اُٹھے اور ہر شخص کے منہ سے بیاختہ واہ واہ بکھجے

آپ خود ہی اُن کا کلام دیکھ لیجئے۔

تجھ کو اس میری آہ وزاری پر رحم اے فتنہ گر نہیں آتا

وعدہ شام تو کیا لیکن کچھ وہ آتا نظر نہیں آتا

تیرے بیمار کا ہے یہ عالم ہوش دو دو پہن نہیں آتا

تعریف تو ہوئی مگر کچھ اُن کے دل کو نہ لگی اس لیے ذرا آزرہ سے ہو گئے۔

ان کے بعد شمع میر حسین تجلی کے سامنے آئی۔ یہ میر تقی میر کے پوتے

ہیں۔ ٹھہرے طریق اور نکتہ سیخ آدمی ہیں۔ کلام میں وہی میر صاحب کا رنگ

جھلکتا ہے، زبان پر جان دیتے ہیں۔ غزل تو چھوٹی سی ہوتی ہے مگر جو کچھ

کہتے ہیں اچھا کہتے ہیں۔ کیوں نہ ہو، آخر کس کے پوتے ہیں۔
 مری وفا پہ تجھے روز شک تھا لے ظالم یہ سہرا یہ تیغ ہے، لے اب تو اعتبار آیا
 یہ شوق دیکھو پس مرگ بھی تجلی نے کفن میں کھول دیں آنکھیں سنا جو یا ر آیا
 دوسرے شعر پر یہ تعریف ہوئی کہ میاں تجلی کی باچھیں کھل گئیں۔
 میاں تجلی پڑھ چکے تو حکیم سکھاندر تم کی باری آئی، ان کو میں حکیم ہومن خاں
 صاحب کے مکان پر دیکھ چکا تھا۔ کلام تو ایسا اچھا نہیں ہوتا مگر پڑھتے
 خوب ہیں۔ جہاں کسی نے ذرا بھی تعریف کی اور انھوں نے سلام کا تار باندھ لیا
 غزل لکھی تھی:-

بجھانا آنکھ دل کا بھی کچھ حقیقت ہو ذرا سا کام تجھے چشم تر نہیں آتا
 عدم سے کچھ قاتل کی راہ ملتی ہے گیا ادھر جو گزر بھرا ادھر نہیں آتا
 ہو خاک چارہ گری اس مریض کی تیرے نظر میں تجھ سا کوئی چارہ گری نہیں آتا
 تیسرا شعر حکیم ہومن خاں صاحب کے رنگ کا تھا، اس کی انھوں نے
 بہت تعریف کی، مگر اس کے ساتھ یہ بھی کہا ”میاں ر قمر! یا تو تم حکمت ہی کرو
 یا شعر ہی کہو۔ ان دونوں چیزوں کا ملا کر چلنا ذرا مشکل کام ہے۔“

شمع کا شیخ نیاز احمد جوش کے سامنے جانا تھا کہ شاگردان ذوق ورا سنہل
 بیٹھے۔ جوش کو استاد ذوق بہت عزیز رکھتے ہیں۔ ان کی عمر تو ۱۸، ۱۹ سال کی
 ہے۔ مگر بلا کے طباع اور ذہین ہیں۔ ان کی سخن گوئی اور سخن منہی کی قلعے بھر
 میں دھوم ہے، مگر شاعرے میں انھوں نے جو غزل پڑھی وہ تو مجھے کچھ پسند
 نہ آئی، ہاں قلعے والوں نے واہ واہ کے شور سے مکان سر پر اٹھا لیا۔ استاد
 ذوق نے بھی سبحان اللہ سبحان اللہ کہہ کہہ کر شاگرد کا دل بڑھا یا غزل دیکھ لیجئے
 ممکن ہے کہ میں نے ہی غلط اندازہ لگایا ہو۔

کیونکہ وہ ہاتھ آئے کہ یاں زور و زور نہیں
لے دے کے ہن اک آہ سوا بسیم اثر نہیں

نہت سے درو بھی تو ہوا وہ ہمیں نصیب
جس درو کا کہ چارہ نہیں، چارہ گر نہیں
نہت ہی میں نہیں ہے شہادت و گزریاں
دور خم کوں ہے کہ جو کار گر نہیں

سجدے میں کیوں پڑا ہے ارے اٹھ شراب پی
ارے جو شش میکہ وہ ہے خدا کا یہ گھر نہیں

آپ نے غزل ملاحظہ کر لی۔ میں تو اب بھی یہی کہوں گا کہ کوئی شعر بھی ایسا نہیں
ہے جو تعریف کے قابل ہو اب زبردستی کی تعریفیں کرنا دوسری بات ہے۔
اُن کے بعد مولوی امام بخش صہبائی کے بڑے فرزند محمد عبدالعزیز کا
ممبر آیا۔ یہ عزیز تخلص کرتے ہیں۔ غزل خوب کہتے ہیں۔ کیوں نہ ہو، بڑے
باپ کے بیٹے ہیں۔ ہائے کیا کیا شعر نکالے ہیں، لکھتے ہیں۔

جوں شمع شغل تیرے سراپا نیاز کا جلتا جو سوز کا ہے تو رونا گھ اذ کا
کچھ نہیںوں سے خلق کی دیکھا کہ کیا ہوا منصور کو حریف نہ ہونا تھا راز کا
بہم عاصیوں کا بارگنہ سے بھجکا ہے سر اور خلق کو گمان ہے ہم پر نماز کا
مغزور تھا ہی اور وہ مغزور ہو گیا اس میں گلہ نہیں مجھے آئینہ ساز کا
اوروں کی تھیں لطف سے تھا صورت نیاز یاں بڑھ گیا دماغ تعافل سے ناز کا

دراستہ کہئے گا، ساری کی ساری غزل مرصع ہے یا نہیں۔ ہاں اس
غزل کی جو کچھ تعریف ہوئی وہ بجا ہوئی۔ استاد ذوق نے بھی کہا ”بھلی صہبائی
تھا راز کا غضب کا لکھا ہے، خدا کی عمر میں برکت دے، ایک دن بٹانام

پیدا کر لیا۔ واہ میاں صاحبزادے واہ! کیا کہنا ہے! دل خوش ہو گیا۔ کیوں نہ ہو! ایسوں کے ایسے ہی ہوتے ہیں۔“ میاں عزیز نے اٹھ کر سلام کیا اور بیٹھ گئے۔

میاں عزیز کے بعد شمع خواجہ معین الدین بیکتا کے سامنے آئی۔ اُن کا کہنا۔ سرکار سے خطاب خانی پایا ہے، کسی کو خاطر ہی میں نہیں لاتے، کبھی کسی کے شاگرد ہوتے ہیں، کبھی کسی کے۔ پہلے احسان سے تلمذ تھا، آج کل مرزا غالب کی طرف ڈھلک گئے ہیں۔ ایسے متلون مزاجوں کو نہ کبھی کچھ کہنا آیا ہے، نہ آئیگا۔ میرا بڑا دل خوش ہوا کہ کسی نے تعریف نہیں کی۔ بڑے جلد ہونگے۔ بھلا ایسے شعروں کی کوئی خاک تعریف کرے۔

اے آہ شعلہ زایہ حسن و خار بھی نہیں نو آسماں میں، دو بھی نہیں چار بھی نہیں
ہے کسکو تاب شکوہ دشمن کہ ضعف سے لب پر ہمارے تذکرہ یار بھی نہیں
جینا فراق یار میں وعدے کی لاگ پر آسان گرنے سے تو دشوار بھی نہیں
ہاں اب جس کے سامنے شمع آئی ہے وہ شاعر ہے۔ یہ کون ہیں؟ مرزا حاجی بیگ شہرت۔ گورازنگ، میانہ قد، کوئی ۳۰، ۳۲ برس کی عمر، بڑے بنے سنورے رہتے ہیں۔ پہلے ابھی کے مکان پر مشاعرہ ہوتا تھا، اب تھوڑے دنوں سے بند ہے۔ مفتی صدر الدین صاحب کے شاگرد و رشید ہیں۔ کہتے بھی خوب ہیں اور پڑھتے بھی خوب ہیں، بڑی پاٹ دار آواز ہے، پڑھنے کا ڈھنگ ایسا ہے کہ ایک ایک لفظ دل میں اُترتا جاتا ہے۔ ہر شعر پر تعریفیں ہوئیں اور کیوں نہ ہوتیں۔ ہر شعر تعریف کے قابل تھا، غزل یہ ہے

ایک دن، دو دن، کہاں تک، تو بھی کچھ انصاف کر
یہ تو جلمنا روز کا اے سوز، حسمراں ہو گیا

ہے ترقی جو ہر قابل ہی کے شایاں کہ میں
 خاک کا پتلا بنا، پتلے سے انسان ہو گیا
 کفر و دیں میں تھانہ کچھ عقدہ بجز بند نقاب
 اس کے کھلتے ہی یہ کارِ مشکل آساں ہو گیا
 پہلے دعوائے خدائی اُس بُتِ کافر کو تھکا
 کچھ درستی پر جو آج آیا تو انسان ہو گیا
 آخری شعر پر تو مرزا غالب کی یہ حالت بھی کہ گویا بالکل مست ہو گئے ہیں،
 رانوں پر ہاتھ مارتے اور کہتے "واہ میاں شہرت واہ اکمال کر دیا" شعر
 کیا ہے اعجاز ہے۔ یہ ایک شعر بڑے بڑے دیوانوں پر بھاری ہے۔ ہاں
 کیا کہا ہے، سبحان اللہ! پہلے دعوائے خدائی اُس بُتِ کافر کو تھکا۔ کچھ درستی
 پر جو آج آیا تو انسان ہو گیا، غرض اس شعر نے ایک عجیب کیفیت مغل میں
 پیدا کر دی تھی، لوگ خود پڑھتے، ایک دوسرے کو سناتے، مزے لے لے کر
 جھومتے اور جوش میں واہ واہ اور سبحان اللہ کے لغزے مارتے۔ بڑی دیر میں
 جا کر مغل میں ذرا سکون ہوا تو شمع نوازشِ خاں تنویر کے سامنے گئی۔ یہ نوجوان
 آدمی ہیں۔ کوئی ۳۲، ۳۳ برس کے ہونگے۔ بادشاہ سلامت اُن کو بہت
 عزیز رکھتے ہیں، میاں شہرت کے شعر نے وہ جوش پیدا کر دیا تھا کہ اُن کی غزل
 کسی نے بھی عوز سے نہیں سُنی، غزل بھی معمولی تھی، صرف یہ قطعہ خاصہ تھا۔
 جان کر دل میں مجھے اپنا مریضِ تنغم کتنا لوگوں سے بظاہر بُتِ عیار ہو گیا
 رنگِ رخِ زرد ہے، ترچہ پیم، لبِ پردہم پوچھنا اس سے کہ اس شخص کو آزار ہے کیا
 یہ پڑھ چکے تو شمع میرزا بہادر علی حزمین کے سامنے رکھی گئی۔ یہ بڑے سنجیدہ
 متین، اور وضع دار آدمی ہیں، عارن کے شاگرد ہیں۔ اُن کا ایک شعر بڑے مرنے

کا ہے۔

سب سے منہ لگا بیٹے اب اتنا صبر ہے کس کو
کہ بھرے خم سے مے شیشے میں اور شیشے سے سائیں
جو غزل اُنھوں نے اس روز مشاعرے میں پڑھی تھی، اُس کے یہ دو تین شعر
اچھے تھے۔

دنیا کی وسعتیں ترے گوشے میں لگیں اللہ ری و عقیں تری اتونگنائے دل
جل جل کے آخرش تیشِ غم کے ہاتھ سے اک داغ رہ گیا مرے پہلو میں جائے دل
دیکھا وہ اپنی آنکھ سے جو کچھ سنا تھا اور دیکھے حزیں ابھی کیا کیا دکھا دل
مقطع کو سب نے پسند کیا اور واقعی ہے بھی اچھا۔

ان کے بعد شمع ایسے شخص کے سامنے آئی جو خود شاعر، جبکہ اب شاعر،
جبکہ بھائی شاعر، جس کا سارا خاندان شاعر۔ وہ کون؟ میاں باقر علی جعفری
فخر الشعراء نظام الدین ممنون کے چھوٹے بھائی، ملک الشعراء قمر الدین منت
کے چھوٹے بیٹے۔ ان کی غزل میں زور نہوگا تو اور کس کی غزل میں ہوگا۔
غزل تھی۔

تین یوں دل میں خیال نگہ یار نہ کھینچ ناخدا ترس تو کعبے میں تو تلموار نہ کھینچ
بے سرو پا چینِ دشت میں عالم کے پھر ناز ہر گل نہ اٹھا منتبت ہر خار نہ کھینچ
غزل کی جیسی چاہیے ویسی تعریف نہیں ہوئی۔ وجہ یہ ہے کہ یہ رنگ اب دہلی
سے اٹھتا جاتا ہے۔ اب تو روزمرہ پر لوگ جان دیتے ہیں، اس میں اگر مصنفین
پیدا ہو گیا تو سبحان اللہ۔ مرزا غالب اس رنگ کے بڑے دلدادہ تھے، وہ بھی
اسکو اب چھوڑتے جا رہے ہیں۔

اس کے بعد منشی محمد علی تشنہ کے پڑھنے کی باری تھی۔ چوہدر اُن کے

سامنے شمع رکھنے میں ذرا ہچکچایا۔ یہ ننگ دھڑنگ مڑے میں دو زانو بیٹھے جھوم رہے تھے۔ چوہدار نے مرزا فرخزاد کی طرف دیکھا، آنکھوں نے آنکھ سے اشارہ کیا کہ رکھ دے، اُس نے شمع رکھ دی۔ جب شمع کی روشنی آنکھوں پر پڑی تو میاں تشنہ نے بھی آنکھیں کھولیں، کچھ سمجھ کر بھونک مار شمع گل کر دی اور کہا میں بھی کچھ عرض کروں۔ سب نے کہا ”ضرور فرمائیے“ آنکھوں نے نہایت آزادانہ بجے میں کچھ گاتے ہوئے، کچھ پڑھتے ہوئے یہ غزل سنائی :-

آنکھ پڑتی ہے کہیں، پاؤں کہیں پڑتا
سب کی ہر دم کو خبر، اپنی خبر کچھ بھی نہیں
شمع ہو، گل بھی ہو، بلبل بھی ہو پر تو کبھی
رات کی رات یہ سب کچھ ہی سحر کچھ بھی نہیں
حشر کی دھوم ہے سب، ہیں یوں یوں
فتنہ ہے اک تری ٹھوکرا گلہ کچھ بھی نہیں
نستی کی ہے مجھے کوچہ ہستی میں تلاش
سیر کرتا ہوں اُدھر کی کہ جدھر کچھ بھی نہیں
ایک آنسو بھی اثر حبیب کرے اور تشنہ
فائدہ رونے سے اے دیدہ ترکھ کچھ بھی نہیں

میں کیا بتاؤں کہ اس غزل کا کیا اثر ہوا۔ ایک سناٹا تھا کہ زمین سے آسمان تک چھایا ہوا تھا۔ غزل کا مضمون، آدھی رات کی کیفیت، پڑھنے والے کی حالت، غرض یہ معلوم ہوتا تھا کہ ساری محفل کو سانپ سونگھ گیا ہے اور دھریہ عالم طاری تھا، اُدھر میاں تشنہ ہاتھ جھٹکتے ہوئے اور ”کچھ بھی نہیں“ کچھ بھی نہیں“ کہتے ہوئے اٹھے اور اسی عالم بے خودی میں دروازے سے باہر نکل گئے۔ ان کی ”کچھ بھی نہیں، کچھ بھی نہیں“ کی آواز بڑی دیر تک کانوں میں گونجتی رہی۔ جب ذرا طبیعتیں سنبھلیں تو سب کے منہ سے بے اختیار یہی نکلا کہ ”واقعی کچھ بھی نہیں“۔

مرزا فرخزاد نے شمع ننگا کر روشن کی اور کہا ”ہاں صاحب پھر شروع کیجیے“ شمع حافظ محمد حسین بیکل کے سامنے رکھی گئی۔ بھلا تشنہ کے بعد ان کا

کیا رنگ جمنا۔ اول تو یہ نوشق ہیں، مرزا قادر بخش صابر سے اصلاح لیتے ہیں، دوسرے غزل میں بھی کوئی خاص بات نہ تھی، البتہ مقطع اچھا تھا غزل ملاحظہ ہو۔

دل تو نے ہم سے اُوبتِ کافر اٹھالیا اس نازِ کمی پہ بوجھ، یہ کیونکر اٹھالیا
بارگراںِ عشقِ فلک سے نہ اُٹھ سکا کیا جانے میرے دل نے یہ کیونکر اٹھالیا
بیرمغاں نے بسملِ میکش کو دیکھ کر شیشہِ بغل میں ہاتھ میں ساغر اٹھالیا

بہر حال کسی نے سُنا کسی نے نہیں سُنا، کچھ کھوڑی بہت تعریف بھی ہوئی اور شمع میر حسین تسکین کے پاس پہنچ گئی۔ اُن کی کوئی ۴۰ برس کی عمر ہو گئی۔ صہبائی کے شاگرد ہیں، مومن سے بھی اصلاح لی ہے، ان کا خاندان

دہلی میں بہت مشہور ہے، انہی کے دادا میر حمید نے میر حسین علی وزیر فرخ میر کو مارا تھا۔ سچا ہی پیشہ آدمی ہیں، شعر بھی بُرا نہیں کہتے۔ لکھا تھا:-

۱۔ ہزار طرح سے کرنی پڑی تسلی دل کسی کے جانے سے گو خونیں قرار مجھے

۲۔ شربتِ صال میں سُننا پڑا فسادِ غیر سبھتے کاش وہ اپنا نہ راز دار مجھے

۳۔ وہ اپنے وعدے پچھتر میں جلو فرمایا نہیں ہے ضعفِ انبوہ میں گزار مجھے

۴۔ میرے قصور سے دیدار میں ہو تاخیر نہ دیکھنا تھا تماثلے روزگار مجھے

مزے یہ دیکھے ہیں آغازِ عشق میں تسکین

کہ سو جھبتا نہیں اپنا مال کا ریختے

غرض اس غزل نے مشاعرے کا رنگ پھر درست کر دیا اور لوگ ذرا سنبھل کر ہو بیٹھے۔ استاد احسان کے شاگرد خواجہ غلام حسین بیدل کے سامنے شمع آئی، اُنھوں نے یہ غزل پڑھی۔

نگہ کی چشم کی، زلف دو ما کی سے ایک دل جفا کس کس بلا کی

کب اُس گل کی گلی تک جاسکے ہے ہوا باندھی ہے یاروں نے ہوا کی
 ہتوں سے ملے ہو راتوں کو بیدل نکھیں بھی دن لگے، قدرت خدا کی
 ساری کی ساری غزل پھپھسی تھی، بھلا اسکی کون تعریف کرتا۔ ہاں
 اسکے بعد جو غزل محمد حسین صاحب تائب نے پڑھی اس میں مزہ آگیا۔ میاں
 تائب مولانا شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی کے بھتیجے ہیں اور فخر الشعراء
 نظام الدین ممنون کے شاگرد۔ چھوٹی بھر میں ایسی غزل لکھتے ہیں کہ سجان لٹ
 اوپر پڑھنا تو ایسا ہے کہ تعریف نہیں ہو سکتی۔ غزل تھی۔

پھر کتاں وار جگر چاک ہوا پھر کوئی ماہ لستا یا د آیا
 کہیے اس بت کو مشاہد کس کے دیکھ کر جس کو خدا یا د آیا
 عہد پیری میں جوانی کی اُننگ آہ کس وقت میں کیا یا د آیا

دوسرے اور تیسرے شعر پر تو یہ حال تھا کہ لوگ تعریفیں کرتے کرتے اور میاں
 تائب سلام کرتے کرتے تھکے جاتے تھے، جب دوا جو ش کم ہوا تو شمع اُستاد
 ذوق کے اُستاد غلام رسول شوق کے سامنے آئی۔ بچارے بڑھے آدمی ہیں
 شاہ نصیر کے شاگرد ہیں، مسجد عزیز آبادی میں امامت کرتے ہیں۔ شروع
 شروع میں اُستاد ذوق نے ان کو اپنا کلام دکھایا تھا۔ اسی پر یہ اپنے
 آپ کو ان کا اُستاد کہا کرتے ہیں اور اب بھی چاہتے ہیں کہ ذوق اُسی طرح
 آکر مجھ سے اصلاح لیا کریں، مجھے تو کچھ سٹھپائے ہوئے سے معلوم ہوتے
 ہیں غزل جو پڑھی تو واقعی اُس کا مطلع بڑے زور کا تھا۔ باقی اللہ خیر سلا۔

لکھا ہوا ہے یہ اس مہ جبین کے پرے پر

نہیں ہے کوئی اب ایسا زمیں کے پردے پر

استاد ذوق کے چھیڑے کو غالب، مومن، آزاد، صہبائی عرض جیتنے

استادان فن تھے سب نے میاں شوق کی بڑی واہ واہ کی۔ وہ سمجھے کہ میرے کلام کی تعریف ہو رہی ہے۔ یہ نہ سمجھے کہ بنا رہے ہیں۔ ذرا کسی نے واہ واہ کی اور انھوں نے استاد ذوق کی طرف دیکھ کر کہا۔ ”دیکھا شعریوں کہتے ہیں“ وہ بچارے ہنس کر خاموش ہو جاتے، اُن کے ایک آدھ شاگرد نے جواب دینا بھی چاہا مگر انھوں نے روک دیا۔

خدا خدا کر کے اُن سے فراغت ہوئی تو شمع آزاد کے سامنے آئی۔ ان کا نام الگز نڈر ہیڈلے ہے۔ قوم کے فرانسیسی ہیں۔ دہلی میں پیدا ہوئے یہیں تربیت پائی، اور یہیں سے توپ خانے کے کپتان ہو کر الور گئے۔ کوئی ۲۱ سال کی عمر ہے، ڈاکٹری بھی جانتے ہیں، شعر و سخن کا بہت شوق ہے عارف کے شاگرد ہیں، جہاں مشاعرے کی خبر سنی اور دہلی میں آ موجود ہوئے لباس تو وہی فوجی ہے، مگر بات چیت اُردو میں کرتے ہیں۔ ایسی صاف اُردو بولتے ہیں جیسے کوئی دہلی والا بول رہا ہے، شعر بھی کچھ بُرے نہیں ہوتے۔ ایک فرانسیسی کا اُردو میں ایسے شعر کہنا واقعی کمال ہے غزل ملاحظہ ہو۔

وہ گرم روہاہ معاصی ہوں جہاں میں گرمی سے رہا نام نہاں میں تری کا
کچھ پاؤں میں طاقت ہو تو گردشِ نوری باہتوں سے مزہ دیکھ ذرا جیبی کا
چہلم کو عیادت کے لیے وہ مرے آئے آزاد ٹھکانا بھی ہے اس یجری کا
آزاد کے بعد شمع دوسری طرف میر شجاعت علی لٹلی کے پاس آئی
بچارے غریب صورت، فرسودہ لباس، کوئی ۶۵، ۶۷ برس کے آدمی ہیں،
شاہ نصیر کے بڑے چاہیئے شاگردوں میں تھے۔ اپنے زمانے کے جرأت سمجھے
جاتے تھے، اب بہت دنوں سے دنیا سے کنارہ کشی کر کے قدم شریف میں
جا رہے ہیں۔ مشاعرے کی کشش کبھی کبھی اُن کو دہلی کھینچ لاتی ہے۔ پڑھنے

کا انداز بھی نرالا ہے، اس طرح پڑھتے ہیں جیسے کوئی باتیں کرتا ہو غزل دیکھ لیجئے یہ معلوم ہوتا ہے کہ عاشق و معشوق میں سوال جواب ہو رہے ہیں۔

کیسی کھٹو کر جڑی ہے حضرت دل پاؤں پر اس کے سر و سر تو سہی
جب کہا میں نے تم پہ مرتا ہوں ق تم گلے سے مرے لگو تو سہی
بوئے وہ کیا مزے کی باتیں ہیں خیر ہے کچھ، پرے ہٹو تو سہی
غیر کے کل و دو لگ کے چھاتی سے ق مجھ سے کہنے لگے سنو تو سہی
اس لیے اُس کے ہم گلے سے لگے کہ ذرا جی میں تم جلو تو سہی
اس غزل کی جیسی تعریف ہونی چاہیئے تھی ویسی نہیں ہوئی، کیونکہ
اب وہ وقت آگیا تھا کہ نیند کے خمار سے سر میں چکر آنے لگے تھے اور بُرے
بھلے کی تیز و شوار ہو گئی تھی، اس کے بعد جو ایک دو غزلیں ہوئیں وہ بس
ہو گئیں، نہ کسی نے شوق سے سُنا اور نہ مزہ آیا۔

میاں تسلی کے بعد شوہر نے غزل پڑھی۔ یہ کوئل کے رہنے والے ہیں،
قوم کے عیسائی ہیں اور نام جابج پیس ہے۔ یہ معلوم نہیں کہ کس کے شاگرد
ہیں۔ ہاں اکثر دہلی آتے جاتے رہتے ہیں جو کچھ کہہ لیتے ہیں، بہت غنیمت
ہے۔ غزل :-

عاجز تھا اپنی جان سے ایسا تر امراض دیکھے سے جسکے حالت عیسیٰ تباہ تھی
بل بے یہ بیخودی کہ خودی سے بھلا دیا ورنہ یہ زلیست مرگ کی اپنے گواہ تھی
ویر و حرم میں تو نہ دے ترجیح ز اہدا جس طرف سر جھکا وہی بس سیو گا تھی
ان کے بعد محمد عسکری نالائک کی باری آئی۔ بھلا اس نوے برس کے
بڑھے کی آواز نیند کے خمار میں کسی کو کیا سُنانی دیتی۔ مصحفی کے سب سے پہلے
شاگرد ہیں۔ اب تو ان کو بس تبرک سمجھ لو۔ شعر بھی دہی یا واؤ دم کے وقت کے

کہتے ہیں۔

سحر کے ہونے کا دل کو خیال رہتا ہے شب وصال بھی دل کو ملال رہتا ہے
وہ بدگماں ہوں کہ اس بت سایہ پر بھی رقیب ہی کا سد احتمال رہتا ہے

میاں نالائے نے پڑھا ختم ہی کیا تھا کہ شمع میر صاحب کے سامنے پہنچ گئی
شمع کا رکھنا تھا کہ ہر شخص سنبھل کر بیٹھ گیا۔ بعض نے انگلیوں سے آنکھیں مل
ڈالیں، بعض نے کرتے کے دامن سے رگڑیں، بعض اٹھ اور پانی کا چھچکا
منہ پر مار آ بیٹھے، کیسی نیند اور کہاں کا سونا، میر صاحب کے نالے سب کو جاق چوبند
کر دیا۔ مرزا فخر داب تک ایک پہلو پر بیٹھے تھے، اُنھوں نے بھی پہلو بدلا۔ اُستاد اُن
فن کے چہروں پر مسکراہٹ آئی، نوجوانوں میں سرگوشیاں ہونے لگیں، میر صاحب
بھی صفت سے کچھ آگے نکل آئے۔ مرزا فخر نے کہا ”میر صاحب یہ ٹھیک نہیں
آپ تو بیچ میں آکر پڑھئے۔“ یہ کہہ کر چوبدار کو اشارہ کیا، اُس نے دو شمعیں اُٹھا
وسط صحن میں رکھ دیں۔ میر صاحب بھی اپنی جگہ سے اُٹھ شامیانے کے عین
سامنے آ بیٹھے۔ بھلا دہلی میں کون ہے جو میر صاحب کو نہیں جانتا، کونسا مشاعرہ
ہے جو اُن کی وجہ سے چمک نہیں اُٹھتا، کونسی محفل ہے جہاں اُن کے قدم کی
برکت سے رونق نہیں آ جاتی۔ اُن کا نام تو شاید گنتی کے چند لوگ جانتے ہوں
ہم نے تو جب سنا اُن کا نام میر صاحب ہی سنا۔ کوئی ستر برس کی عمر ہے۔
بڑے سوکھے سے آدمی ہیں، علانی آنکھیں، طوطے کی چونچ جیسی ناک،
بڑا دمانہ، لمبی داڑھی، بیٹا سا سر، خشخاشی بال، گوری رنگت، ادبچا قد،
عرض ان کے حیلے کو دہلی کے کسی بچے سے بھی پوچھیے تو پورا پورا پتہ دے۔
نہایت صاف ستھرا لباس، سفید ایک برکاپا بجامہ، سفید کُتر اسپر سفید
انگڑکھا، سر پر رنجبین (عرق چین) ٹوپی، چہرے پر متانت بلا کی تھی۔ مگر جب

غصہ آتا تھا تو پھر کسی کے سنبھالے نہ سنبھلتے تھے۔ چھوٹا ہوا بڑا کوئی اُن سے بغیر مذاق کے بات نہیں کرتا تھا اور یہ بھی ترط سے وہ جواب دیتے تھے کہ منہ پھر جا اس سے اُن کو غرض نہ تھی کہ جواب بھی کیا یا نہیں۔ مشاعرے میں میاں تمکین سے لیکر بادشاہ سلامت تک اُن کو چھیڑتے تھے۔ اُنھوں نے نہ ان کا بُرا مانا نہ اُن کا، جواب دینے میں نہ ان سے رُکے نہ اُن سے۔ غزل ہمیشہ فی البدیہہ پڑھتے تھے، لکھنا لانے کی کبھی تکلیف گوارا نہیں کی۔ غزل میں مصرعوں کے توازن کی ضرورت ہی نہ تھی، صرف قافیہ اور ردیف سے کام تھا۔ جو کچھ کہنا ہوا نہایت اطمینان سے نثر میں بیان کرنا شروع کیا۔ بیچ میں دوسروں کے اعتراضوں کا جواب بھی دیتے رہے۔ جب کہتے کہتے تھک گئے تو ردیف اور قافیہ لاشع کو ختم کر دیا۔ اُنھوں نے شعر بڑھنا شروع کیا اور چاروں طرف سے اعتراضوں کی بوچھاڑ ہو گئی۔ یہ بھلا کب دینے والی آسامی ہیں جو کُھا لڑتے۔ جب زبان سے نہ دبا سکتے تو زور میں آکر کھڑے ہو جاتے۔ یہ کھڑے ہوئے اور کسی نہ کسی نے ان کو بٹھادیا۔ معترض کو ڈانٹا، میر صاحب کا دل بٹھایا اور پھر وہی اعتراضوں کا سلسلہ شروع ہوا۔ اور تو اور مولوی مملوک اعلیٰ صاحب کو ان سے اُلجھنے میں مزا آتا تھا۔ یہ بھی مولوی صاحب کی وہ خبر لیتے تھے کہ اگر ان کا کوئی شاگرد سن لیتا تو مدرسے سے مولوی صاحب کا سارا عیب و اب رخصت ہو جاتا۔

میر صاحب نے شمع کے سامنے بیٹھتے ہی ساری محفل پر ایک نظر ڈالی اور

لے غدر کے بہت بعد میر صاحب کا انتقال ہوا ہے۔ میاں کالے صاحب کے فرزند میاں نظام الدین صاحب کے مکان پر جو مشاعرہ ہوتا تھا اس میں بھی یہ شریک ہوتے تھے۔ اس مشاعرہ کے دیکھنے والے اب بھی دہلی میں بہت موجود ہیں۔ انہی لوگوں کی زبانی میر صاحب کے حالات معلوم ہوئے اور رزق کیے گئے۔ تذکروں میں تو ان پر اسے کاکیلوں ذکر آئے لگا۔

کہا ”حضرات! میں آج میاں ہد ہد کی شان میں ایک قصیدہ سناؤں گا اپنے
مُٹھ میاں مٹھو، یہ اپنی تعریف خود تو بہت کچھ کر چکے ہیں اب دزد دل لگا کر اپنی
ہجو بھی سُن لیں۔“

میاں ہد ہد سے سب جلے بیٹھے تھے، اب جو سنا کر اُن کی ہجو ہو رہی ہے
اور پھر وہ بھی میر صاحب کے مُٹھ سے، سب نے کہا ”ہاں میر صاحب ضرور فرمائیے“
میاں ہد ہد حکیم آغا جان عیش کے چھوٹے اور اُٹھنی کے بل پر پھدکتے تھے، اب
جو حکیم صاحب نے سنا کہ میر صاحب ہد ہد کی ہجو پُر اُتر آئے ہیں تو بہت پریشان
ہوئے، ڈر تھا کہ میں مجھ کو بھی نہ لپیٹ لیں، دوسرا کوئی ہجو کرے تو جواب بھی
دیا جائے بھلا میر صاحب کی بحر طویل کا کون جواب دے سکتا ہے۔ اور تو کچھ بن نہ
پڑا، میاں ہد ہد کو گاؤں تکیہ کے پیچھے غائب کر دیا۔ اب جو میر صاحب ادھر نظر
ڈالتے ہیں تو ہد ہد نثار دہیں، بہت گھبرائے، ادھر دیکھا ادھر دیکھا، جب
کسی طرف نظر نہ آئے تو کہا ”ہجو ملتوی کر کے اب میں غزل پڑھتا ہوں“ سب نے
کہا ”ہیں! میر صاحب! یہ آپ نے ارادہ کیوں تبدیل فرما دیا، پڑھیے میر
صاحب! خدا کے لیے پڑھیے۔ سودا کے بعد ہجو تو اردو زبان سے اُٹھ ہی آئی
اگر آپ بھی اس طرف توجہ نہ کریں گے تو غضب ہو جائیگا، زبان ادھوری رہ جائیگی“
میر صاحب نے کہا، ”ناجی! میاں ہد ہد ہوتے تو ہم کو جو کچھ کہنا تھا ان کے
مُٹھ پر کہتے، اُن کے پیٹھ پیچھے ان کو کچھ کہنا، جو نہیں، غیبت ہے، اور میں غیبت
کرنے والوں پر لعنت بھیجتا ہوں۔“ جب میر صاحب کا یہ رنگ دیکھا تو حکیم
آغا جان کے دم میں دم آیا انھوں نے بھی اس ہجو اور غیبت کے فرق کے متعلق
چند مناسب الفاظ کہے اور خدا خدا کر کے یہ آئی بلا ملی۔

اب میر صاحب نے غزل شروع کی، کیا پڑھا، خدا ہی بہتر جانتا ہے

بس اتنا تو معلوم ہوا کہ تیرا پیرا کھیر، قافیہ۔ اور ”ہے“ ردیف ہے۔ اسکے علاوہ میں تو کیا، خود میر صاحب بھی نہیں بتا سکتے کہ اُنھوں نے کیا پڑھا اور مضمون کیا تھا۔ جہاں قافیہ اور ردیف آئی لوگوں نے سمجھ لیا کہ شعر پورا ہو گیا اور تعریفیں شروع ہوئیں۔ کسی نے ایک آدھ اعتراض بھی جڑ دیا۔ اعتراض ہوا اور میر صاحب بگڑے۔ ان کے بگڑنے میں سب کو مزا آتا تھا۔ اعتراضوں اور میر صاحب کے جوابوں کا رنگ بھی دیکھ لیجئے۔ غزل میں میر صاحب نے جو ایک مصرعہ کو کھینچنا شروع کیا تو اتنا کھینچا، اتنا کھینچا کہ شیطان کی آنت ہو گیا۔ مولوی مملوک العلی صاحب نے کہا ”اجی میر صاحب! یہ مصرعہ بحر طویل میں جا پڑا“ میر صاحب نے کہا ”مولوی صاحب کبھی بحر طویل دیکھی بھی ہے یا یوں ہی، مثنیٰ مثنائی باتوں پر اعتراض ٹھونک دیا۔ پہلے مطول پڑھے، مطول۔ لے جب معلوم ہو گا کہ بحر طویل کس کو کہتے ہیں۔“ مولوی صاحب بڑے جکڑائے، کہنے لگے ”میر صاحب! بھلا مطول کو بحر طویل سے کیا واسطہ، ماروں گھٹنا چھوٹے آنکھ، آپ کا جو جی چاہتا ہے کہہ جاتے ہیں۔“ میر صاحب کو اب کسی حمایتی کی تلاش ہوئی۔ مولانا صہبائی کی طرف دیکھا۔ اُنھوں نے کہا ”مولوی صاحب! مطول میں بحر طویل کی بحریں نہیں ہیں تو اور کیا ہے، آپ بھی ہمارے میر صاحب کو اپنی تعلیمت کے دباؤ سے خاموش کر دینا چاہتے ہیں۔“ بس اتنی مدد ملنی تھی کہ میر صاحب شیر ہو گئے۔ کہنے لگے۔ ”جی ہاں مولوی صاحب آپ سمجھ ہونگے کہ آپ کے سوا کسی نے مطول پڑھی ہی نہیں۔“ اجی حضرت میں تو روزا زاسکے دو دور کرتا ہوں، کل ہی اسکی ایک بحر میں غزل لکھنے بیٹھا تھا۔ لکھتے لکھتے تھک گیا، ایک مصرعہ کوئی پونے دو سو صفحے میں لکھا، وہ تو کہو کہ بیاض کے لے علم سمانی و بلا غنت پر علامہ نقی زانی کی ایک مشہور تصنیف کا نام مطول ہے۔

صفحہ ہی ختم ہو گئے جو مصرعہ ختم ہوا، ورنہ خدا معلوم اور کہاں تک جاتا۔ مرزا نوشہ نے کہا ”میر صاحب! آپ سچ فرماتے ہیں ہمارے مولوی صاحب نے بحر طویل کہاں دیکھی، مجھ سے پوچھو، میرے بھتیجے خواجہ امان کو جانتے ہو، اُس نے ایک کتاب بوستان خیال لکھی ہے۔ یہ یہ بڑی اور یہ موٹی بارہ جلدیں ہیں، بحر طویل کے بس بارہ مصرعوں میں ساری جلدیں ختم ہو گئی ہیں۔ آپ کا مصرعہ بحر طویل میں نہیں رباعی کی بحر میں ہے“ میر صاحب نے بڑے زور سے ”ہیں“ کی اور بگڑ کر کہا ”واہ مرزا صاحب سیدھے چلتے چلتے آپ بھی بھٹک گئے، رباعی کی بحر میں آپ کو معلوم بھی ہیں، بھلا بتائیے تو سہی کونسی کتاب میں ہیں؟“ یہ ذرا ٹیڑھا سوال تھا، مرزا غالب ذرا چپ ہو تو خود میر صاحب نے کہا ”میں تو پہلے ہی جانتا تھا کہ آپ نے زبردستی اعتراض کر دیا ہے۔ مرزا صاحب! اربعین پڑھیے جب معلوم ہو گا کہ رباعی کی بحر میں کون کونسی ہیں۔“

غرض اسی طرح کی خوش مذاقی میں کوئی گھنٹہ بھر گزر گیا۔ ہنستے ہنستے جو آنسو نکلے انھوں نے نیند کے خمار سے آنکھیں صاف کر دیں اور ایسا معلوم ہونے لگا گویا مشاعرے کا دوسرا دور شروع ہو رہا ہے اور سب لوگ تازہ دم ابھی آکر بیٹھے ہیں۔ جب لوگ اعتراض کرتے کرتے اور میر صاحب جواب دیتے دیتے تھک گئے تو ایک دفعہ ہی میر صاحب نے کہا ”حضرات! غزل ختم ہوئی“ سب نے کہا ”میر صاحب! ابھی مقطع تو آیا ہی نہیں، بے مقطع کی کیسی غزل“ میر صاحب نے فرمایا ”مقطع کی اُس شاعر کو ضرورت ہے جو بتانا

۱۷۷ اربعین فی اصول الدین حضرت امام غزالی (رح) کی ایک مشہور تصنیف ہے جسکو میر صاحب نے رباعیوں کی بحروں سے متعلق کر دیا۔

چاہے کہ یہ غزل میری ہے، ہمیں اسکی ضرورت نہیں، ہماری غزل کی یہی پہچان ہے، جہاں شروع کی بس معلوم ہو گیا کہ یہ میر صاحب کے سوا اور کسی کی نہیں ہو سکتی۔ یہ کہتے کہتے اُنھوں نے جزدان گردانا اور اپنی جگہ آ بیٹھے۔ ایک شمع اُٹھا کر میر صاحب کے عین مقابل کے شاعر مرزا جمعیت شاہ ماہر کے سامنے رکھ دی گئی۔ یہ شاہ عالم بادشاہ غازی انارا اٹھ برہمانہ کے پوتے اور صابر کے شاگرد ہیں۔ کلام صاف اور زبان بڑی میٹھی ہے، لکھا تھا۔

ہم بھی ضرور کعبہ کو چلتے پر اب تو شیخ قسمت سے تنگدے ہی میں دیدار ہو گیا
ناصح کی بات سننے کا کسکو بیان باغ تیرا ہی ذکر تھکاکہ میں ناچار ہو گیا
اے ہمنشین وہ حضرت ماہر نہ ہوں کہیں ایک پار سا، سنا ہے کہ میخوار ہو گیا
میر صاحب کے کلام نے سب کی آنکھوں سے نیند کا خمار اُتار دیا تھا، اسلئے اس غزل کی جیسی چاہیے ویسی تعریف ہوئی اور میاں ماہر کو محنت کا پورا پورا صلہ مل گیا۔

ان کے بعد شمع قاضی نجم الدین برق کے سامنے آئی، یہ سکندر آباد کے رہنے والے ہیں۔ کوئی ۲۰، ۲۲ برس کی عمر ہے۔ سر پر لمبے لمبے بال، سانولی رنگت، اس میں سبزی جھلکتی ہوئی، اونچا قد، وجیہ صورت، سفید غرارہ دار پیجامہ، سفیدانگر کھا، دو پلڑی ٹوپی، بڑے خوش مزاج، شیریں کلام، مہنس مکھ، بذلہ سنج، وارستہ مزاج، رند مشرب آدمی ہیں۔ پہلے میوٹیاں کے شاگرد تھے پھر ان کے ایسا سے میاں لشکین کو کلام دکھائے گئے، آواز بڑی دلکش اور طہر زاد خوب ہے، غزل بھی ایسی پڑھی کہ واہ! واہ! کہتے ہیں:-

بزم اختیار ہے، ڈر ہے نہ خفا تو ہو جائے ورنہ اک آہ میں کھینچو تو ابھی ہو ہو جائے

حرم و دیر کے جھگڑے ترے چھینے سے پئے
ورنہ تو پردہ اٹھائے تو، تو ہی تو ہو جائے
کچھ مزہ ہے یہ ترے روٹھ کے من جانے کا
چاہتا ہوں یوں ہی ہر روز خفا تو ہو جائے
تو تو جس خاک کو چاہے وہ بنے بند پاک
میں خدا کس کو بناؤں جو خفا تو ہو جائے
آپ انکار کریں، وصل سے میں درگزر
کچھ تو ہو، جس سے طبیعت مری کچھ ہو جائے
ہو نہ ہو، بس میں کوئی، کچھ نہیں سکی پڑا
دل بیتاب پہ اسے برق جو قابو ہو جائے

اللہ، اللہ! درو دیوار سے بے خودی برس رہی تھی۔ جب یہ مصرعہ پڑھا
کہ ”میں خدا کس کو بناؤں جو خفا تو ہو جائے“ تو ساری محفل پر ایک سستی سی
چھا گئی۔ اور تو اور! اسے ان فن کی بھی یہ حالت تھی کہ بار بار شعر پڑھوا سنے،
خود پڑھتے اور مزے لیتے تھے۔

ابھی ان کی تقریفیں ختم نہ ہوئی تھیں کہ شمع مرزا سچلے المتخلص منوں
کے سامنے رکھی گئی۔ یہ نوجوان آدمی ہیں۔ مرزا اکرم بخش مرحوم کے فرزند اور
حضرت ظل سبحانی کے نواسے ہیں۔ ان کا کیا کہنا، زبان تو ان کے گھر کی لونڈی
ہے، گما کر غزل پڑھتے ہیں، پڑھتے کیا ہیں جادو کرتے ہیں۔ ان کی غزل
کے دو شعر لکھتا ہوں۔

اللہ رے جذبہ دل مضطر کہ تیر کا باہر ہمارے پہلو کے سونار بھی نہیں
کچھ آپ ہی آپ ل یہ مرا بٹھا جائے ہی نظر ہر میں تو اکھی میں بیمار بھی نہیں
دوسرے شعر میں الفاظ کیا بٹھائے ہیں، نگینے جڑ دے ہیں، آخر
کیوں نہ ہو، قلعہ کے رہنے والے ہیں۔ ان کے بعد سیدھی جانب سے شمع
سرک کر لالہ بالما کند حقنور کے سامنے آئی۔ یہ ذات کے کھتری اور خواجہ میر درد
کے شاگرد ہیں۔ کوئی ۷۰، ۸۰ برس کا سن ہے۔ سفید نورانی چہرہ، اس پر
سفید لباس، بغل میں انگو چھپ، کندھوں پر سفید کشمیری رو مال بس جی چاہتا

تھا کہ ان کو دیکھے ہی جائیے۔ شمع سامنے آئی تو اُنھوں نے عذر کیا کہ میں اب سناٹے کے قابل نہیں رہا۔ سُننے کے قابل رہ گیا ہوں جب سبھوں نے اصرار کیا تو اُنھوں نے یہ قطعہ پڑھا:-

نہ پاؤں میں خنیش نہ ہاتھوں میں طاقت جو اٹھ، کھینچیں اسن، ہم اسن لربا کا
سیر راہ بیٹھے ہیں اور یہ صدا ہے کہ اللہ والی ہے بے دست و پا کا
قطعہ اس طرح پڑھا کہ خود تصویر ہو گئے۔ ”نہ پاؤں میں طاقت“ کہتے
ہوئے اٹھے مگر پاؤں نے یاری نہ کی، لڑکھڑاکر بیٹھ گئے۔ ”نہ ہاتھوں میں
طاقت“ کہہ کر ہاتھ اٹھائے مگر ضعف سے وہ بھی کچھ یوں ہی اٹھ کر رہ گئے۔
دوسرا مصرعہ دراتیز پڑھا۔ تیسرا مصرعہ پڑھتے وقت اس طرح بیٹھ گئے،
جیسے کوئی بے دست و پا سیر راہ بیٹھ کر صدا لگاتا ہے، اور ایک دفعہ ہی
دونوں آنکھوں کو آسمان کی طرف اٹھا کر جو چوتھا مصرعہ پڑھا تو یہ معلوم ہوا
تھا گویا ساری مجلس پر جادو کر دیا۔ ہر ایک کے منہ سے تعریف کے بجائے
بے ساختہ یہی نکل گیا۔ کہ ”اللہ والی ہے بے دست و پا کا۔“ استاد ذوق
نے کہا ”استاد! یہ خدا کی دین اور خواجہ میر درد کا فیض ہے، سبحان اللہ!
کیسا موثر کلام ہے۔ ہم دنیا داروں میں یہ اثر پیدا ہونے کے لیے میر درد
ہی جیسا استاد چاہتے۔“

اس کلام کے بعد مرزا غلام محی الدین اشکی کی غزل بھلا کون سنتا،
یہ شاہ عالم بادشاہ غازی کے پوتے ہیں۔ کوئی ۴۰ سال کی عمر ہے، اونچا قد،
سفید پوش، ثقہ صورت آدمی ہیں، پہلے نظام الدین ممنون سے اصلاح
لیتے تھے۔ اب مفتی صدر الدین کے شاگرد ہو گئے ہیں۔ لکھا تھا:-
کچھ وجہ نہیں غمِ مطرب ہی پہ موتوں کما فی ہے بیاں نالہ بے ربط و راکا

سجدے میں گرے دیکھ کے تصویریت شگیا معلوم ہوا آپ کا خرقة ہوتا رہا کہ
ان کے بعد شمع صاحبزادہ عباس علی خاں بیتاب کے سامنے آئی،
۳۲-۳۳ کا سن ہو گا۔ رامپور کے رہنے والے اور مومن خاں کے شاگرد
ہیں۔ نواب مصطفیٰ خاں شفیقتہ سے بڑی دوستی ہے۔ انہی کے ساتھ مشاعرہ
میں آگئے تھے۔ بڑی اونچی آواز میں غزل پڑھی۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ
تحت اللفظ پڑھ رہے ہیں۔ غزل تو کچھ اچھی نہ تھی مگر قطعہ ایسا تھا کہ تعریف
نہیں ہو سکتی۔ بیخانے کی تقسیم ایسی خوبی سے کی تھی کہ سبحان اللہ! ہائے
لکھا ہے:-

مہمور ہے خدا کی عنایت سے میکدہ ساقی اگر نہیں جڑ، نہ ہوانے سے کام ہے
بیتاب پی، خدا نے تجھے بھی دیے ہیں ہاتھ یہ خم ہے یہ سب وہی یہ شیشہ یہ جام ہے
بھلا ایسے بڑے مشاعرے میں مرزا فخر الدین حسنت کو پڑھنا کیا ضرور تھا،
نہ کلام ہی اچھا، نہ پڑھنے کی طرز ہی اچھی۔ مگر ان کو روک کون سکتا تھا، شہزادے
تھے اور وہ بھی شاہ عالم بادشاہ کے پوتے۔ خیر پڑھ لیا اور بھائی بندوں نے
تعریفیں بھی کر دیں، خوش ہو گئے۔ غزل یہ تھی:-

ترے بیمار ہجران کا ترے بن یہ عالم ہے کہ عالم نوحہ گر ہے
مجھے روتے جو دیکھا ہنسکے بولے سرے حسنت بتا کیوں چشم تر ہے

ہاں ان کے بعد جس کے سامنے شمع آئی وہ نوجوان سہی مگر شاعر ہے، اور ایسا
شاعر ہو گا کہ ہندوستان بھر میں نام کرے گا۔ بھلا کونسا مشاعرہ ہے جس میں مرزا
قربان علی بیگ سالک کی غزل شوق سے نہیں سُنی جاتی، اور کونسا شعر ہوتا ہو
جو بار بار نہیں پڑھوایا جاتا۔ جو ایک دفعہ بھی کسی مشاعرہ میں گیا ہے وہ ان کو
دور سے پہچان لے گا۔ چھوٹا سا قد، دبلے پتلے ہاتھ پاؤں، موٹی سی ناک،

چھوٹی چھوٹی آنکھیں، موٹی جلد، گندمی رنگ، اس پرچیپک کے داغ،
چھدری چھوٹی سی داڑھی، کٹوں پر کم، ٹھوڑی پرور ازیاوہ، سر پر خنکاشی بال
کوئی ۳۰ سال کی عمر۔ بس بخار کے ترک معلوم ہوتے ہیں۔ ہاں لباس اُن لوگوں
سے مختلف ہے۔ بچی چولی کا انگرکھا۔ تنگ مہری کا پانجامہ، سر پر سفید گول
ٹوپی، ہاتھ میں سفید ٹٹھے کا رومال، شمع کا ان کے سامنے آتا تھا کہ سب
سنبھل کر بیٹھ گئے۔ اُنہوں نے بھی انگرکھے کی آتیں اُلٹ، ٹوپی کو اچھی طرح جما
اپنے اُستاد مرزا غالب کی طرف دیکھا۔ ادھر سے مسکرا کر کچھ اشارہ ہوا تو اُنہوں
نے صاحب عالم کی طرف دیکھ کر عرض کی ”اجازت ہے؟“ مرزا فرخو نے کہا
”ہاں میاں سالک پڑھو۔ آخر اس میں اجازت کی ضرورت ہی کیا ہے؟“ سالک
نے جیب میں سے کاغذ نکالا، کچھ اُلٹا پلٹا، پھر ایک بار سنبھل کر کہا،
”عرض کیا ہے۔“

انتہا صبر آزمائی کی	ہے درازی شبِ جدائی کی
ہے بُرائی نصیب کی، کہ مجھے	تم سے اسید ہے بھلائی کی
نقش ہے سنگ آستانِ پیر	داستانِ اپنی جہ سائی کی
ہے فغاں بعد امتحانِ فغاں	پھر شکایت ہے نارسائی کی
کیا نہ کرنا وصالِ شادی پر	تم نے کیوں مجھے بیوفائی کی
راز کھلتے گئے مہ سہا پر	جب قدر اس نے خود غنائی کی
کتنے عاجز ہیں ہم کہ پاتے ہیں	بندے بندے میں بو خدا کی
گہ گہن دل میں حسرتیں سالک	آگئی عمر پار سائی کی

ایک ایک شعر پر یہ عالم تھا کہ مجلس لوٹی جاتی تھی۔ ایک ایک شعر کئی کئی بار
پڑھوایا جاتا تھا۔ ایک ایک لفظ پر تعریفیں ہوتیں اور ایک ایک بندش کی داد

ملتی۔ استاد ذوق نے تیسرے شعر پر کہا ”وہ میاں سالک کیا کہتا ہے سب ہی جہ سائی باز دھتے آئے ہیں، بھاری داستان کو کوئی نہیں پہنچا، کیا کلام ہے، کیا روانی ہے، سبحان اللہ“ حکیم مومن خاں نے کہا ”میاں سالک! یہ جوانی اور مقطع میں یہ بوڑھا مصنون، بھاری ”عمر پار سائی“ کو بہت دن پڑے ہیں، ابھی سے تو بڑھوں کی سی باتیں نہ کیا کرو۔“ میاں سالک نے جواب دیا، ”استاد میں تو جوانی ہی میں بڑھا ہو گیا، دیکھئے بڑھا پا دیکھتا نصیب بھی ہوتا ہے یا نہیں، بھرول میں آئے ہوئے مصنون کیوں چھوڑ دوں بعد میں یہ کون دیکھتا پھرے گا کہ یہ شعر بڑھے نے کہا تھا یا جوان نے، ہم نہ رہینگے مصنون رہ جائیگا۔“

جب تعریفوں کا سلسلہ ذرا دکا تو شمع مرزا حیم الدین ایچاؤ کے سامنے آئی۔ یہ شہزادے مرزا حسین بخش کے صاحبزادے اور مولانا صہبائی کے شاگرد ہیں۔ کوئی ۲۴، ۲۵ سال کی عمر ہے۔ شعر کہتے ہیں مگر پھیکے، ہاں پڑھتے بڑی اچھی طرح ہیں۔ گانا خوب جانتے ہیں۔ ان کی آواز شعر کی کمزوری ظاہر ہونے نہیں دیتی۔

تجائے میں تھا پاک میں کعبہ کے قریں تھا اے زاهد ناداں تجھے کیا ہر میں کہیں تھا
ہر چند کہ میں دوست کے ہمارا نہیں تھا پردل وہ بلا ہے، وہ جہاں تھا یہ میں تھا
توڑا ہے یہ کچھ آپ کو میں نے کہ جہاں میں ثابت نہ رہا نام کا جو میرے نگیں تھا
غزل میں تو کیا خاک مزا آتا ہاں اُن کے گانے میں مزا آ گیا۔ گا کر
پڑھنے کا یہ نیاز نگ قلم سے چلا ہے، مگر استاد ان فن اس کو پسند نہیں کرتے۔
ان کے بعد شمع نواب علار الدین خاں علانی کے سامنے آئی۔ اُنھوں نے بہت اونچی آواز میں اپنی غزل سُنائی۔ علانی مرزا غالب کے بڑے

چاہتے شاگرد ہیں، ابھی تو عمر ہیں، شعر اچھا کہتے ہیں۔ کیوں نہ ہو کس کے شاگرد ہیں۔ غزل دیکھ لو استاد کا رنگ غالب ہے۔

آوارگانِ گلگدہ آزاد آرزو
حاشا اگر تمہیں سیر سیر و فراغ ہے
رکھیو سنبھل کے پاؤں جو بینا ہو چشمِ دل
کچھ سمجھ کے کام جو روشن دماغ ہے
وہ گل جو آج ہے قدح موجِ خیز رنگ
وہ لالہ جو کہ باغ کا چشم و چراغ ہے
گل چو رکھل ہے سنگِ جنائے سپہر ہے
گو یا کہ غمگدہ کا شکستہ ایام ہے
اور لالہ تنہا یادِ حوادث سے خاکِ خوں
گو یا دل و جگر کا کسی کے دماغ ہے
جس جا کہ تھا ترانہ بلبیلِ نشاطِ خیز
اُس جا پہ آج دلِ شکر لہزاغ ہے
مغرورِ جاہ سے یہ کو تم علامتِ سیا
کل ایک سطحِ خاک ہے توجہ باغ ہے

علامی کے پاس سے شمع کا ہٹ کر سامنے آنا تھا کہ مرزا اکرم الدین رسا
سنبھل کر بیٹھ گئے۔ ایک بڑی لمبی غزل پڑھی مگر ساری کی ساری بے مزہ نہ الفاظ
کی بندش اچھی، نہ مضامین میں کوئی خوبی، تعقیدوں سے اُٹھن پیدا ہوتی تھی،
اور رعایتِ لفظی سے جی گھبراتا تھا۔ ان کے لبس و وہی شعر منونے کے طور پر
لکھنیا کا فی سمجھتا ہوں۔

باز آ، ستا تو مجھ کو بہت عشوہ گر نہیں
کہ تا کسی نہ ظلم کوئی اس سے نہیں
گو نزع میں ہوں میں تے بے جانِ من
کرنے کی جان بھی مرے تن سے سفر نہیں
یہ پڑھ چکے تو نواب فیض الدین خاں نیرو خشاں کے پڑھنے کی باری
آئی۔ فارسی کے شعر خوب کہتے ہیں، اردو کی غزلیں ذرا پھسکی ہوتی ہیں،
لکھا تھا:-

پی کے گرنے کا ہے خیال نہیں
شب نہ آئے جو اپنے وعدے پر
ساتیا! یسویو سنبھال نہیں
گزرے کیا کیا نہ احتمال نہیں

دل میں مضمحل ہیں معنی باقی کسی صورت نہیں دال ہیں
 ترے غصے نے ایک دم میں کیا مُردہ نہ ہزار سال ہیں
 طالع بد سے نیر رخشاں اپنے ہی گھر میں ہویاں ہیں
 ان کے بعد شمع مرزا پیارے رفت کے سامنے آئی۔ یہ سلاطین زادے
 ہیں، بیٹریں لڑانے کا بڑا شوق ہے۔ شعر بھی خوب کہتے ہیں، پڑھتے بھی
 خوب ہیں، پہلے احسان کے شاگرد تھے، اب مولانا صاحبائی سے تلمذ ہے، کوئی
 ۴۰ سال کی عمر ہو گئی، کھاتا ہے۔

لسانِ طائرِ رنگ پریدہ وحشت سے کسے دماغ ہے اب آغیاں بنانے کا
 نہ عذر تھا ہمیں ہونے میں خاک کے، گر ہم یہ جانتے کہ وہ دامن نہیں بچانے کا
 گندھی تھی کوئی بدست تشنہ لب کی خاک کہ جس سے خم یہ بنا ہے شتر بجلنے کا
 بدوق، ناز کو جسے رخصت حفا کہ میاں ہمیں بھی عزم ہے طاق کے اڑانے کا
 ہیں ایک وہ بھی کہ تم سے ہو جنکو راز دنیا اور ایک ہم ہیں کہ تکتے ہیں نمانے کا
 آخری شعر میں مایوسی کی جو تصویر کھینچی ہے اسکی تعریف نہیں ہو سکتی۔ کوئی
 نہ تھا جو اس شعر کے دوسرے مصرعہ کو پڑھ پڑھ کر نہ جھومتا ہوا اور بار بار واہ
 واہ اور سبحان اللہ نہ کہتا ہو۔ ہوتے ہوتے میاں عارف کا منبر آ ہی گیا، بھلا
 ان کو مشاعرے کے انتظام سے کب فرصت تھی جو غزل لکھتے۔ پھر بھی چلتے
 پھرتے کچھ لکھ ہی لیا تھا، وہی پڑھ دیا، اس دن رات کی گردش کے بعد اتنا بھی
 لکھ لینا کمال ہے۔ غزل تھی۔

اُٹھتا قدم جو آگے کو اسے نامہ نہیں پیچھے تو چھوڑ آئے کیوں اس کا گھر نہیں
 اوروں کو ہو تو ہو، ہمیں مرنیے ڈر نہیں خط لیکے ہم ہی جاتے ہیں گز نامہ نہیں
 بے التفاتیوں کا تری شکوہ کیا کریں اپنے ہی جبکہ نالہ دل میں اثر نہیں

مطلع کی سب نے تعریف کی، اُستاد احسان نے کہا ”میاں عارف! میں بھی شعر کہتے کہتے بڑھا ہو گیا ہوں، لاکھوں شعر سنے، لاکھوں سنائے، مگر یہ مضمون بالکل نیا ہے اور کس خوبی سے ادا کیا ہے کہ دل خوش ہو گیا۔“

میاں عارف کے بعد شمع مرزا اہلام نصیر الدین عرف مرزا تنہا کے سامنے آئی، وہ شہزادہ تھے، احسان کے شاگرد تھے اور فتاحیت تخلص کرتے ہیں۔ غزل خاصی کہتے ہیں۔ میں تو یہی کہنا چاہتا تھا کہ شہزادوں میں بہت کم ایسے شاعر ہوں گے۔ غزل بھی

شوق کو کثرتِ نظارہ سے رشک آتا ہو حشر سے پہلے میسر ہو وہ دیدار مجھے
 کہتے تک جانے میں تھی خاطر زابد و نہ زیر میں بھی تھی سدا رخصت دیدار مجھے
 جنسِ درویدہ کے مانند ہوا بھادوی جان کہ نہ لیتا ہے نہ پھیرے ہے خریدار مجھے
 راز دل لب پہ نہ لانا کبھی منصور کہیاں کر دیا بات کے کہنے نے گنگنا کر مجھے
 شمع کا حکیم آغا جان عیش کے سامنے آنا تھا کہ لوگوں میں سرگوشیاں شروع
 ہوئیں، حکیم صاحب بادشاہی اور خاندانی طبیب ہیں۔ زیور علم سے آراستہ
 اور لباسِ کمال سے پیرا ستہ، صاحبِ اخلاق، خوش مزاج، شیریں کلام
 شگفتہ صورت، جب دیکھو یہ معلوم ہوتا ہے کہ شکر ارہے ہیں، طبیعت ایسی
 ظریف و لطیف اور لطیفہ سنج پائی ہے کہ سبحان اللہ۔ میانہ قد، خوش اندام،
 سر پہ ایک ایک انگل بال سفید، ایسی ہی ڈاڑھی، اس گوری سُرخ و سفید
 رنگت پر کیا بھلی معلوم ہوتی ہے۔ گلے میں ملل کا کرتہ جیسے خنجریلی کا ڈھیر پڑا
 مہنس رہا ہے۔ مگر کچھ دنوں سے ان کے دوست بھی ان سے ذرا کھینچ گئے تھے۔

میاں بدھ کو پال کر انھوں نے سب بگاڑ لی۔ شروع شروع میں تو اسکی وہی
 تباہی باتوں پر کسی نے دعیاں نہیں کیا، لیکن جب اس نے اُستادوں پر حملے

شروع کیے۔ اس وقت سے ہمد کے ساتھ ہی حکیم صاحب بھی لوگوں کو کچھ نفرت سی ہو گئی۔ غضب یہ کیا کہ اجیری دروازے والے مشاعرے میں خود انھوں نے مرزا نوشر پر کھلا ہوا حملہ کر دیا۔ ایک قطعہ لکھا تھا کہ۔

اگر اپنا کما تم آپ ہی سمجھتے تو کیا سمجھتے مزا کہنے کا جب ہے آل کے اردو سرا سمجھتے
کلام میر سمجھتے اور زبان میر سمجھتے مگر ان کا کہا یہ آپ سمجھیں یا نہ سمجھتے
مولوی مملوک العالی نے کہا ”حکیم صاحب، شعر کے سمجھ میں نہ آنے کی

دو ہی صورتیں ہیں یا تو شعر ہی بے معنی ہے یا سمجھنے والے کے دماغ کا قصور ہے۔ ہم سب تو ان کے شعر سمجھتے ہیں، پھر اپنے ساتھ ہم خزیوں کو کیوں لپیٹ لیا۔“ مومن خاں نے کہا ”بھئی مجھے تو اس قطعے کے تیسرے مصرعے میں بھی شاعرانہ تعلی معلوم ہوتی ہے“ بہر حال بڑی مشکل سے معاملہ رفع دفع ہوا۔ اس معرکے کے بعد یہ دوسرا موقعہ تھا کہ حکیم صاحب مشاعرے میں تشریف لائے تھے۔ میر صاحب نے ہمد کے مقابلے میں جو اعلان جنگ کیا تھا وہ سن چکے تھے، اب لوگوں میں جو کانپھوسا ہونے لگی اس سے اور بھی پریشان ہوئے۔ پڑھنے میں تامل کیا۔ آخر مرزا فرحت کے اصرار پر یہ غزل پڑھی

صلح اُن سے ہمیں کیے ہی بنی دل پہ جھگڑا تھا دل دیے ہی بنی
زہد و تقویٰ دھڑے سے سامنے ہاتھ سے اسکے مے پیے ہی بنی
لائے وہ ساتھ خیر کو ناچار پاس اپنے بٹھا لیئے ہی بنی
کس کا تھا پاس شوقِ غم لے بخش اُن جفاؤں پہ بھی سیئے ہی بنی
جب ایسی غزل ہو تو بھلا کون تعریف نہ کرے۔ صلح علی کے شور اور

سبحان اللہ کی آوازوں نے پڑھنے والے اور سننے والوں دونوں کے دلوں سے غبارِ کدورت دور کر دیا اور حکیم صاحب وہی حکیم صاحب ہو گئے جو پہلے

تھے، نہ ان سے کسی کو بچ رہا اور نہ ان کو کسی سے ملال۔ ہاں اگر پہلے کہیں میاں ہد ہد کچھ چرک جاتے تو خدا معلوم مشاعرے کا کیا رنگ ہو جاتا۔ وہ تو خدا بھلا کرے ہمارے میر صاحب کا اکھنوں نے پہلے ہی اس کچھیر و کی زبان بندی کر دی۔ خیر رسید بود بلائے دے بخیر گذشت۔

حکیم صاحب کے بعد مرزا رحیم الدین حیا کا نمبر آیا۔ یہ وہی میاں حیا ہیں جن کی تعریف مشاعرے میں آتے ہی ان کے والد صاحب قبلہ مرزا کریم الدین رسائے فرمائی تھی۔ بڑے خوش طبع، ذہین، نیک فطرت، بدھیکہ اور ظریف آدمی ہیں۔ کوئی ۳۵، ۳۶ سال کی عمر ہے، اکثر بنارس میں رہتے ہیں، کبھی کبھی دہلی چلے آتے ہیں، شکل تو بالکل شاہزادوں کی ہے مگر واڑھی منڈی ہوئی اور لباس لکھنؤ والوں کا سا۔ پہلے اپنے والد کے شاگرد ہوئے پھر شاہ نصیر سے اصلاح لی، اب اپنا کلام استاد ذوق کو دکھاتے ہیں شرط بخ بے مثل کھیلتے ہیں، پہلے حکیم شرافت علی خاں سے سیکھی اب مومن خاں کو گھیرے رہتے ہیں۔ ستار ایسا بجاتے ہیں کہ سجان اللہ شاعر بھی اچھے ہیں مگر محنت نہیں کرتے، زبان کی چاشنی پر مضمون کو نثار کر دیتے ہیں۔ یہ غزل لکھ کر لائے تھے۔

موت ہی چار سا زفرقت ہے	سج مرنے کا مجھ کو راحت ہے
ہو چکا وصل، وقت خفست ہے	اے اجل جلد آکر فرصت ہے
روز کی داد کون دیوے گا	ظلم کرنا تمھاری عادت ہے
کارواں عمر کا ہر رخت بدوش	ہر نفس بانگ کو سن حلت ہے
سائنس اک پھالیں ہی کھلتی ہو	دم نکلتا نہیں مصیبت ہے
تم بھی اپنے حیا کو دیکھ آؤ	آج اُس کی کچھ اور حالت ہے

پانچویں شعر پر ان کے والد نے ٹوکا اور کہا ”میاں جیا! لکھنو جاکر اپنی شکل تو بدل آئے تھے اب زبان بھی بدل دی۔ سانس کو مونٹ باندھ گئے۔“ حیات نے جواب دیا۔ ”جی نہیں قبلہ میں نے تو استاد ذوق کی تقلید کی ہے، وہ فرما رہے ہیں۔“ سینے میں سانس ہوگی اڑی دو گھڑی کے بعد۔ ”بھلا صاحب عالم کب چوکنے والے تھے۔ کہنے لگے۔“ بھلا ہمارے مقابلے میں آپ کے استاد کا کلام کہیں سند ہو سکتا ہے، وہ جو چاہیں لکھیں، یہ بتاؤ قلعے میں سانس نہ کرہے یا مونٹ؟“ بچارے جیسا مسکرا کر خاموش ہو گئے۔

اب شمع مولانا صہبائی کے روبرو آئی۔ ان کی علمیت کا ڈنکا تمام ہندوستان میں بج رہا ہے۔ ایسے جامع الکمال آدمی کہاں پیدا ہوتے ہیں ہزاروں شاگرد ہیں، اکثر ریختہ کہتے ہیں، ان کو اصلاح دیتے ہیں اور خوب دیتے ہیں، مگر خود ان کا کلام تمام و کمال فارسی ہے۔ میں نے تو ریختے میں نہ کبھی ان کی کوئی غزل دیکھی نہ سنی۔ اس شاعرے میں بھی فارسی ہی کی غزل چڑی خوب خوب تعریفیں ہوئیں مگر ایمان کی بات یہ ہے کہ لوگوں کو مزہ نہ آیا۔

ہیچو شبنم خویش را ناغہ ز عالم ساختم
محرّم خورشید گشتم با حساں کم ساختم
مردم و در چشم مردم علمے تار یک گشت
من مگر شمع چو رفتم بزم برہم ساختم
کفر و کشیم سپاس لغت دیدار دوست
جلوہ در ہر رنگ دیدم کرنے خم ساختم
جرم عشقم را جزا شد جو رو من در ہجرت
داغ بر دل بردم و خلدش جہنم ساختم
نیست صہبائی چو جام حجم نصیبم کو مبا
مے زخون دل کشیدم خویش را جم ساختم
مقطع پر تو اتنی تعریفیں ہوئیں کہ بیان سے باہر ہے مگر جو بچارے فارسی نہیں سمجھتے تھے وہ بیٹھے منہ دیکھا کیے۔ صاف بات تو یہ ہے کہ اردو کے مشاعرے

قلعے والوں کو خواہ وہ شہزادے ہوں یا سلاطین زادے، صاحب عالم کہا جاتا تھا۔

میں فارسی کا کھونسا کچھ مجھے بھی پسند نہ آیا۔

اما ماہا! زبان کا لطف اٹھانا ہے تو اب سید ظہیر الدین حسین خاں
ظہیر کو سنئے۔ ابھی ۳۰، ۳۱ سال کی عمر ہے مگر کلام میں خدا نے وہ اثر دیا ہے
کہ وہاں وہاں استاد ذوق کی اصلاح نے اور سونے پر سہاگے کا کام کیا ہے۔
شکل صورت سے یہ نہیں معلوم ہوتا تھا کہ اُن کی طبیعت اس بلا کی ہے، قد
خاصہ اونچا، چھریرا بدن، کشادہ سینہ، سانولی رنگت، کشادہ دہن، اونچی
سمتوں ناک، آنکھیں نہ بہت بڑی نہ بہت چھوٹی مگر روشن، گول دائرہ ہی، نہ
بہت گھنی نہ بہت چھدری، سر پر پٹھے، لباس میں انگریزوں کا تنگ مہری کا سفید
پاجامہ، سر پر سفید گول ٹوپی، خوش مزاج اور لطیفہ سنج ایسے کہ منہ سے پھول
جھڑتے ہیں۔ پڑھنے کا بھی ایک خاص طرز ہے۔ لکھنؤ والوں کے تحت اللفظ پڑھنے
سے ملتا جاتا ہے۔ ساتھ ہی اشاروں سے ایک ایک لفظ کو سمجھاتے جاتے
ہیں۔ غزل ہوئی تھی:-

جہیں اور شوق اسکے آستان کا	ارادہ، اور ارادہ بھی کہاں کا
لٹا ہے قافلہ تاب و تواس کا	خدا حافظ ہے دل کے کارواں کا
مری داماندگی منزل رساں ہے	سرخ نقش یاہوں کارواں کا
رہے پابند دل کے دل میں رما	قدم منزل نے پکڑا کارواں کا
اٹھا سکتے نہیں سر آستان سے	غضب ہے بار منت پاسبان کا
ہمیشہ مورد برق و بلا ہوں	مٹے جھکڑا آئی آستیاں کا
دل بیتاب نے وہ بھی مٹایا،	کسی کو کچھ جو دھوکا تھا نغماں کا
ظہیر! آؤ چلو اب میکدے کو	نکالا زہد و تقویٰ ہے کہاں کا

اور تو اور! استادان فن نے اس غزل کی ایسی داد دی کہ میان ظہیر کا دل غنچے

کی طرح کھل گیا، تیسرے شعر پر تو یہ حالت تھی کہ تعریفوں کا سلسلہ ختم ہی نہ ہوتا تھا سلام کرتے کرتے بچارس کے ہاتھ دکھ گئے ہونگے۔ جب ذرا سکون ہوا تو سیدھی جناب کی شمع نواب مصطفیٰ خاں شفیقہ کے سامنے آئی۔ اُن کا کیا کمنا۔ یہ اُستادانِ فن میں شمار کیے جاتے ہیں۔ مومن کے شاگرد ہیں مگر خود اُستاد ہیں۔ انھوں نے کسی شعر کی تعریف کی اور اس کی وقعت بڑھی۔ یہ سنکر ذرا خاموش ہوئے اور شعر دوسروں کی نظر سے بھی گر گیا۔ زبان کے ساتھ مضمون کو ترتیب دینا ایسے ہی لوگوں کا کام ہے۔ پڑھتے بھی ہیں تو ایک ایک لفظ سمجھا سمجھا کر۔ آواز ایسی اونچی ہے کہ دور اور پاس سب کو صاف سنانی دے۔ غزل پڑھنے سے پہلے ادھر ادھر دیکھا۔ ذرا انگڑا کر درست کیا، ٹوپی درست کی، انگڑی کھے کی آستینوں کو چڑھایا اور یہ غزل پڑھی :-

آرام سے ہے کون جہانِ خراب میں	گلِ سینہ چاک اور صباِ نضر اب میں
سب اس میں مجاور یہ سب کے علاوہ	آئینہ میں ہے آب، نہ آئینہ آب میں
معنی کی فکر چاہیئے صورتِ کیا حصول	کیا فائدہ ہے، موج اگر ہے سراب میں
ذات و صفات میں بھی ہی ربط چاہیئے	جوں آفتابِ روشنی آفتاب میں
وہ قطرہ ہوں کہ موجبِ دریا میں گم ہوا	وہ سایہ ہوں کہ محو ہوا آفتاب میں
بیباک شیوہ، شوخِ طبیعتِ زباںِ درنا	ملزم ہوا ہے پر نہیں عاجز جواب میں
تکلیفِ شفیقہ ہوئی تم کو، مگر حضور	اس وقت اتفاق سے وہ ہیں عتاب میں
غزل تو ایسی ہے کہ بھلا کس کا مُنہ ہے جو تعریف کا حق ادا کر سکے، مگر تعریف	
بڑی سنبھل سنبھل کر کی گئی۔ بڑے شاعروں میں میں نے ہمیشہ یہ دیکھا کہ نو	
شفقوں کے دل تو تعریفوں سے خوب بڑھاتے ہیں مگر جب اُستادوں کے پڑھنے	
کا نوبت آتی ہے تو وہ جوش و خروش نہیں رہتا۔ بلکہ جوش کے بجائے متانت	

زیادہ آجاتی ہے۔ اُستادوں کے اُنھیں شعروں کی تعریف ہوتی ہے جو واقعی قابل تعریف ہوں۔ اگر کسی شعری ذرا بے جا تعریف کر دیجائے تو اس سے اُن کو تکلیف ہوتی ہے۔ یہ صرف اسی کلام کی تعریف چاہتے ہیں جسکو یہ خود سمجھتے ہیں کہ اسکی تعریف ہونی چاہیئے۔ شعر پڑھ کر اگر دیکھتے بھی ہیں تو اپنے برابر والوں کی طرف، اور وہی داد بھی دیتے ہیں، مشاعرے کے باقی لوگ ان کے کلام سے لطف ہی نہیں اُٹھاتے، کچھ حاصل بھی کر لیتے ہیں، اور اُن کے لئے یہ غزلیں استاد کی اصلاح سے کم فائدہ مند نہیں ہوتیں۔

اُن کے بعد شہزادہ مرزا قادر بخش صابری باری آئی۔ یہ کوئی ہم برس کے ہونگے، ان کی شاعری کی قطعہ میں بڑی دھوم ہے، خود اُن کو بھی اپنے کلام پر ناز ہے، شعرائے دہلی کا ایک تذکرہ لکھ رہے ہیں۔ مگر مشہور یہ ہے کہ الف سے لیکر یے تک مولانا صہبائی کا قلم ہے، یہ بیچ ہے یا جھوٹ خدا بہتر جانتا ہے۔ انھوں نے اپنے حالات ایک قطعہ میں لکھے ہیں، وہ نقل کرتا ہوں۔

قطعه

پہلے اُستاد تھے احسان و نصیر و ممتون
پھر ہوا حضرت صہبائی کی اصلاح کا فیض
اور ہم بزم رہے مومن و ذوق غالب
بہند کا فضل و ہنرات پہ ہے جن کی تمام
منعقد ہوتی ہے جب شہر میں بزم انشا
کرتے ہیں اہل سخن وقت و عزت میری
اب اس کلام پر اُن کو استاد کہو یا جو جی چاہے کہو غزل میں بھی ہی پھیکا
رنگ ہے، مضمون بھی کچھ بلند پایہ نہیں ہیں، مگر سارا شہر اُن کو اُستاد ماننا ہے
ہونگے، ممکن ہے میری ہی سمجھ کا پھیر ہو۔ غزل کہی تھی:-

نظارہ برق حسن کا دشوار ہو گیا
مخل میں، میں تو اس لب میگوں کے سینے
حائل ہوئی نقاب تو ٹھہری نگاہ شوق
سعلوم یہ ہو کہ ہے پر سش گناہ کی
اسکی گلی میں آن کے کیا کیا اٹھائے رخ
پیری میں ہم کو قطع تعلق ہوا نصیب
یہ پڑھ چکے تو شمع مفتی صدر الدین صاحب آرزوہ کے سامنے بیٹھی۔

اس پائے کے عالم شاعر نہیں ہوتے۔ اور ہوتے ہیں تو اُستاد ہو جاتے ہیں
مفتی صاحب کے جتنے شاگرد جدید عالم ہیں اس سے کہیں زیادہ اُن کے تلامذہ
شاعر ہیں اور شاعر بھی کیسے کہ بڑے پائے کے مفتی صاحب کہتے تو خوب ہیں
مگر پڑھتے اس طرح ہیں گویا طالب علموں کو سبق دے رہے ہیں۔ آواز بھی ذرا
نیچی ہے لیکن اُن کی وجاہت کا یہ اثر ہے کہ مشاعرے میں شاننا ہوتا ہے۔
اور تعریف بھی ہوتی ہے تو خاص خاص شعروں پر اور بہت نیچی آوازیں ہاں
مرزا نوشہ اُن سے مذاق کرنے میں نہیں چوکتے۔ کبھی کبھی اعتراض بھی کرتے تھے
ہیں اور مزے مزے کی نوک جھونک ہو جاتی ہے۔ ملاحظہ ہو! کیا
پختہ کلام ہے :-

تالوں سے میرے کب تہ وبالاجہا نہیں
افسردہ دل نہ دور رحمت نہیں ہر بند
شب اسکو حال دل نے جتایا کچھ اسطرح
اے دل تمام نفع ہے سوطے عشق میں
کتنی کسی طرح بھی نہیں یہ شب فراق
کب آسماں زمین و زمین آسماں نہیں
کس دن کھلا ہوا در پیر مغاں نہیں
ہیں لب تو کیا، نگہ بھی ہوئی تہ جانیں
اک جان کا زیاں ہے سوا یسا زیاں نہیں
شاید کہ گردش آج تجھے آسماں نہیں

کہتا ہوں اس کچھ میں، بھگتا ہوتا کچھ کہنے کو یوں تو ہیگی زبان در زبان نہیں
 آزرہ ہونٹ ٹانٹ ہلے اس کے روبرو مانا کہ آپ سا کوئی جادو بیاں نہیں
 آزرہ جیسے اُستاد کے بعد نواب مردا خاں داغ کا پڑھنا ایک عجیب
 سی چیز ہے، مگر بات یہ ہے کہ اول تو داغ کو سب چاہتے ہیں دل بڑھاتے ہیں
 اور جانتے ہیں کہ کسی دن یہی داغ ہندوستان کا چراغ ہوگا، دوسرے مرزا
 فخر کے خیال سے ان کو اُستادوں میں جگہ ملی تھی مگر انھوں نے غزل بھی
 ایسی پڑھی کہ اُستاد بھی قائل ہو گئے۔ ۱۸۱۷ء میں اس کے لڑکے کا اس قیامت
 کی غزل اور اس جرأت سے پڑھنا واقعی کمال ہے۔ میری تو یہ رائے ہے
 کہ جو زبان داغ نے لکھی ہے وہ شاید ہی کسی کو نصیب ہوگی۔ دزا زبان کی شوخی،
 مضمون کی رنگینی اور طبیعت کی روانی ملاحظہ کیجئے اور واو دیجئے۔

ساز یہ کینہ ساز کیا جانیں ناز و اے نیاز کیا جانیں
 شمع رو آپ گو ہوئے لیکن لطف سوز و گداز کیا جانیں
 کب کسی در کی جہ سائی کی شیخ صاحب نماز کیا جانیں
 جوڑو عشق میں قدم رکھیں وہ نشیب و فراز کیا جانیں
 بوچھیے میکشور کُطفِ شرب یہ مزا پاک باز کیا جانیں
 جن کو اپنی خبر نہیں اب تک وہ مے دل کاراز کیا جانیں
 حضرت خضر جب شہید نہوں لطفِ عمر و راز کیا جانیں
 جو گزرتے ہیں داغ پر صدے آپ بندہ نواز کیا جانیں

اللہ، اللہ، وہ سہانا وقت، وہ چھوٹی سی آواز، وہ دلکش سُر، وہ الفاظ کی نشست
 وہ بندش کی خوبصورتی اور سب سے زیادہ یہ کہ وہ داغ کی بھولی بھولی شکل، ایک
 عجیب لطف دے رہی تھی۔ ساری محفل میں کوئی نہ تھا جو محو حیرت نہ ہو گیا ہو، اور

کوئی نہ تھا جسکے منہ سے جزاک اللہ، سبحان اللہ اور صل علی کے الفاظ سیاختہ نہ نکل رہے ہوں۔ مرزا فرخ دکی تو یہ حالت تھی کہ گھڑی گھڑی پہلو بدلتے اور دل ہی دل میں خوش ہوتے تھے۔ غزل ختم ہوئی اور کسی کو معلوم نہ ہوا کہ کب ختم ہو گئی۔ جب شمع حکیم مومن حاکم مومن کے سامنے پہنچ گئی۔ اُس وقت لوگوں کا جوش کم ہوا اور اس ریختے کے استاد کے کلام سننے کو سب ہمہ تن گوش ہو گئے اُنھوں نے شمع کو اٹھا کر ذرا آگے رکھا، ذرا سنبھل کر بیٹھے، بالوں میں انگلیوں سے کنگھی کی، ٹوپی کو کچھ ترچھا کیا، آستینوں کی چٹ کو صاف کیا اور بڑی درد انگیز آواز میں دلپذیر ترنم کے ساتھ یہ غزل پڑھی:-

اُس لئے وہ شکوے کرتے ہیں اور کس داکے بٹھا	بے طاقتی کے طعنے ہیں عذرِ جفا کے ساتھ
بہر عیادت آئے وہ لیکن قضا کے بٹھا	دم ہی نکل گیا مرا آوازِ پا کے ساتھ
مانگا کریں گے اب سے دعا ہجریار کی	آخر تو دشمنی ہے اثر کو دعا کے ساتھ
ہے کس کا انتظار کہ خوابِ عدم سے بھی	ہر بار چونک پڑتے ہیں آوازِ پا کے ساتھ
سوزِ ندگی نشانہ کروں ایسی موت پر	یوں روئے نازِ راز تو اہلِ عزاء کے ساتھ
بے پردہ غیرِ پاس اسے بیٹھانا دیکھتے	اُٹھ جاتے کاش ہم بھی جہاں جیا کے ساتھ
اُس کی گلی کہاں یہ تو کچھ باغِ خلد ہے	کس جلتے مھکھو چھوڑ گئی موت لاکے ساتھ
اُندر سے گم رہی، بت دیجانا چھوڑ کر	مومن چلا ہے کعبہ کو اک پارسا کے ساتھ

شاعری کیا تھی، جادو تھا۔ تمام لوگ ایک عالمِ محبت میں بیٹھے تھے، وہ خود بھی اپنے کلام مزالے رہے تھے جس شعر میں اُن کو زیادہ لطف آتا تھا اُسکو پڑھتے وقت اُن کی انگلیاں زیادہ تیزی سے بالوں میں چلنے لگتی تھیں بہت جوش ہوا تو زلفوں کو انگلیوں میں بل دیکر مڑوڑنے لگے کسی نے تعریف کی تو گردن جھکا کر ذرا مسکرا دیے۔ پڑھنے کا طرز بھی سب سے جدا تھا۔ ہاتھ بہت کم ہلاتے

تھے، اور ہلاتے بھی کیسے، ہاتھوں کو بالوں سے کب فرصت تھی۔ ہاں آواز کے زیر و بم اور آنکھوں کے اشاروں سے جادو سا کر جاتے تھے۔ غزل ختم ہوئی تو تمام شعرا نے تعریف کی۔ مسکندہ مسکرائے اور کہا ”آپ لوگوں کی یہی عنایت تو ہماری ساری محنت کا صلہ ہے۔ میں تو عرض کر چکا ہوں

ہم داد کے خواہاں ہیں نہیں طالبِ زر کچھ تحسین سخن فہم ہے مومن صلہ اپنا
اُن کے بعد شمع استاد احسان کے سامنے آئی۔ میں سمجھا تھا کہ ان کی آواز کیا خاک نکلے گی۔ مگر شمع کے پہنچنے ہی وہ تو کچلی سی بدل کچے سے کچے ہو گئے اور اتنی بلند آواز سے غزل پڑھی کہ تمام مجلس پر چھا گئے۔ کسی شعر پر مومن خاں کو متوجہ کرتے، کسی پر مرزا نوشہ کو، کسی پر استاد ذوق کو۔ ان کی عظمت کچھ لوگوں کے دلوں پر ایسی چھائی ہوئی تھی کہ جس کو انھوں نے متوجہ کیا۔ اس کو تعریف ہی کرتے بن پڑی۔ ردیف سخت اور قافیہ مشکل تھا۔ مگر ان کی استاد کی داد دینی چاہی کہ ان دشواریوں پر بھی ساری کی ساری غزل مرتع کہہ گئے ہیں۔ ہائے نکھتے ہیں۔

تو کیوں ہے گریہ کنارا و محروں محزون نہ رونہ رو کہ نہ تجھ کو کبھی ملے خدا
بتو! بتاؤ تو، کیا تم خدا کو دو گے جواب خدا کے بندوں پہ یہ ظلم بندہ ملے خدا
رضا پہ تیری ہونِ نِلا ت اور صنم مصروف جو اس پہ تو نہیں امنی، نہ ہو، راضی خدا
بتو! کہ کچے میں کہتا تھا کل ہی احسان یہاں کسی کا نہیں ہو کوئی سولے خدا
جب یہ پڑھ چکے تو مرزا غالب کی باری آئی۔ یہ رنگا ہی دوسرا تھا۔

صبح ہو چلی تھی، شمع کے سامنے آتے ہی فرماتے گئے ”صاحبو! میں بھلی بی بھر دیں
الایا ہوں۔“ یہ کہہ کر ایسے دلکش اور مؤثر لہجے میں غزل پڑھی کہ ساری محفل مرد
ہو گئی۔ آواز بہت اونچی اور پردہ تھی۔ یہ معلوم ہوتا تھا کہ گویا مجلس میں کسی کو

اپنا قد روان نہیں پاتے اور اس لیے غزل خوانی میں فریاد کی کیفیت پیدا ہو گئی ہے۔ غزل تھی :-

دلِ ناداں تجھے ہوا کیا ہے	آخر اس درد کی دو کیا ہے
ہم ہیں مشتاق اور وہ بیزار	یا آہی یہ ماجرا کیا ہے
میں بھی مُنہ میں زبان کھتا ہوں	کاش پوچھو کہ مدعا کیا ہے
جبکہ تجھ بن کوئی نہیں ہو جو	پھر یہ ہنگامے خدا کیا ہے
یہ پری چہرہ لوگ کیسے ہیں	عمرِ زہ و عشوہ واد کیا ہے
شکرِ زلفِ عنبریں کیوں ہے	مگر چشمِ سرِ سیا کیا ہے
سبزہ و گل کہاں سے آئے ہیں	اب کیا چیز ہے ہوا کیا ہے
ہم کو اُن سے وفا کی ہے امید	جو نہیں جانتے وفا کیا ہے
ہاں بھلا کر ترا بھلا ہو گا	اور درویش کی صدا کیا ہے
جان تم پر نثار کرتا ہوں	میں نہیں جانتا دعا کیا ہے
میں نے مانا کہ کچھ نہیں غالب	مفت ماتھے آئے تو بُرا کیا ہے

غزل پڑھ کر مسکرائے اور کہا ”اب اس پر بھی نہ سمجھیں وہ تو بھراُن سے خدا سمجھے۔“ حکیم آغا جان سمجھ گئے اور کہنے لگے ”مرزا صاحب! غنیمت ہے کہ تم اس رنگ کو آخر ذرا سمجھے۔“ عرض تعریفوں کے ساتھ ساتھ مذاق بھی ہوتا رہا اور شمع استاد و ذوق کے سامنے پہنچ گئی۔ استاد نے مرزا فخر کی طرف دیکھ کر کہا ”صاحب عالم غزل پڑھوں یا کل جو قطعہ ہوا ہے وہ عرض کروں کل رات خدا جانے کیا بات تھی کہ کسی طرح نیند ہی نہ آتی تھی۔ لوٹتے لوٹتے صبح ہو گئی، شب ہجر کا مزا آ گیا۔ اسی کشمکش میں ایک قطعہ ہو گیا ہے۔ اجازت ہو تو عرض کروں۔“ مرزا فخر نے کہا ”استاد! آج کا مشاعرہ سب بندوں

سے آزاد ہے بغزل پڑھیے، رباعی پڑھیے، قصیدہ پڑھیے۔ قطعہ پڑھیے۔ غرض جو
دل چاہے پڑھیے، ہاں کچھ نہ کچھ پڑھئے ضرور۔ استاد ذوق سنبھل کر بیٹھ گئے اور
یہ قطعہ ایسی بلند اور خوش آئند آواز میں پڑھا کہ محفل گونج اٹھی اور اُن کے پڑھنے
کے انداز نے کلام کی تاثیر میں اور زیادہ زور پیدا کر دیا۔

کہوں کیا ذوق احوال شب ہجر	کہ تھی اک اک گھڑی سو سو مہینے
نہ تھی شب ڈال رکھا تھا اک اندھیر	مرے بخت سیہ کی تیرگی نے
تب غم شمع ساں ہوتی نہ تھی کم	اور آتے تھے پسینوں پر پسینے
یہی کہتا تھا گھبرا کر فلک سے	کہ او بے مہر بد اختر کیسے بنے
کہاں میں اور کہاں شب لگرتے	مری جانب تیرے دل میں کہنے
سو اس ظلمت کے پرفے میں کیے ظلم	ارے ظالم تری کینہ وری نے
عوض کس بادہ نوشی کے مجھے آج	پڑے یہ زہر کے تے گھونٹ پینے
حواس دہوش جو مجھ سے قریں تھے	قرینے سے ہوئے سب قریں
مری سینہ زنی کا شور سنکر	پھٹے جاتے تھے ہمایوں کے سینے
اٹھایا گاہ اور گاہ بٹھایا	مجھے بتیابی و بے طاقتی نے
کہا جب دل نے تو کچھ کھائے سو	بہت الماس کے توڑے نگینے
نہ ٹوٹا جان کا قالب سے رشتہ	بہت سی جان توڑی جا نکلی نے
بہت دیکھا نہ دکھلایا ذرا بھی	طلوع صبح سے منہ ردشنی نے
کہاجی نے مجھے یہ ہجر کی رات	یقین ہے صبح تک دیگی نہ جینے
لگے بانی جو انے منہ میں آسو	پڑھی یا سیں سر بانے بیکسی نے
مگر دن عمر کے تھوڑے سے باقی	لگا رکھے تھے میری زندگی نے
کہ قسمت سے قریب خانہ میرے	اذاں مسجد میں دی بارے کسی نے

بشارت مجھ کو صبح وصل کی دی اذان کے ساتھ یمن فرخانی نے
ہوئی ایسی خوشی اللہ اکبر کہ خوش ہو کر کما خود یہ خوشی نے
مؤذن مرحباً بروقت بولا تیری آواز کے اور مدینے
آخری شعر پر پہنچے تھے کہ برابر کی مسجد سے آواز آئی :-

”اللہ اکبر! اللہ اکبر! اللہ اکبر! اللہ اکبر! اس کے ساتھ ہی سب کے منہ سے
نکلا۔ ”تیری آواز کے اور مدینے۔“ اذان ختم ہوئی تو سب نے دعا کو ہاتھ
اٹھائے۔ دعا سے فارغ ہو کر مرزا فخر نے کہا ”صاحبو! کچھ عجیب اتفاق ہے
کہ فاتحہ بخیر ہی سے یہ مشاعرہ شروع ہوا تھا اور اب فاتحہ خیر ہی پر ختم ہوتا
ہے۔“ یہ کہہ کر انھوں نے دونوں شمعوں کو جو چمک رہا تھا کہ ان کے سامنے آگ لگی
تھیں بجھا دیا تھا۔ شمعوں کے گل ہوتے ہی نقیبوں نے آواز دی۔ ”حضرات
مشاعرہ ختم ہوا۔“ یہ سننا تھا کہ چلنے کو سب کھڑے ہو گئے۔ سب سے پہلے
مرزا فخر و سوار ہوئے اور پھر سب ایک کر کے رخصت ہوئے۔ آخر میں ہمیں
اور نواب زین العابدین خاں رہ گئے۔ میں نے ان کا شکریہ ادا کیا۔
کہنے لگے ”میاں کریم الدین! یہ تمہاری نیک نیتی تھی جو اتنا بڑا مشاعرہ
بہ خیر و خوبی ختم ہوا۔ تمہارا کام بھی بن گیا اور میرا ارمان بھی نکل گیا
اچھا خدا حافظ۔“

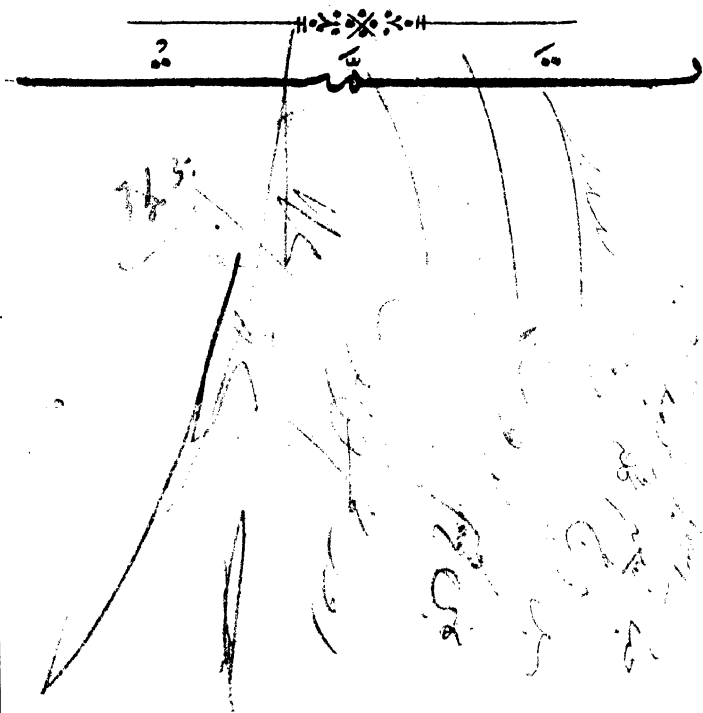
تقدیر

درماندگی میں غالب کچھ بن پڑے تو جانوں
جب رشتہ بے گرہ تھا، ناخن گرہ کشا تھا
دوسرے روز سب سامان اٹھ گیا۔ اور پھر وہی چھاپے خانہ کی گھر گھر

اور پرسیسینوں کی گرد بڑ شروع ہو گئی۔ میں نے دوسرے مہینے پھر شاعرہ کا اعلان کیا، اشتہار بھی تقسیم کیے، مگر گنتی کے آدمی آئے۔ آخر یہ مجلس بند کرنی پڑی۔ کچھ تو مطبع کے کام میں نقصان ہوا، کچھ ملازمین پیشگی رقمیں دبا بیٹھے، غرض ہتھوڑے ہی دنوں بعد میرے دو چار جاہل شرکانے مجھ سے فریب کر کے مطبع چھین لیا۔ ”ہر خند کہ میں نے سوچا تھا کہ اگر دعویٰ کروں، حاکم بے شک میرا انصاف کرے گا، لیکن چند صد مات پڑ جانے کی وجہ سے وہ ارادہ بھی پورا نہ ہوا۔“ اس مشاعرے کی کیفیت کے مسودات پڑے رہ گئے ہیں، دیکھیے کب چھپتے ہیں اور کون چھاپتا ہے۔ فقط

میں چھاپتا ہوں میرزا صاحب اور نیچے پتہ چھاپ دیا۔

حسنِ نظر عالی



غدر دہلی کی تاریخ کا بارہواں حصہ

غدر کا تاریخ

غدر کے زمانہ کی ایک فارسی کتاب ترجمہ

مع

مہید تشریح حضرت خواجہ حسن نظامی دہلوی

سید ابن عربی

کارکن حلقہ مشائخ بک ڈپو دہلی نے

دسمبر ۱۹۳۰ء میں چھپوا کر شائع کیا

مطبوعہ محبوب طابع برقی پریس دہلی قیمت ۸ ر

طبع اول

لال قلعہ دہلی وائٹس کے نام

تیاغ غدر دہلی کا یہ بارھواں حصہ ”غدر کا نتیجہ“
دہلی کے لال قلعہ میں گڑے ہوئے اُن اونچے اونچے
چھ کھمبوں کے نام معنون کرتا ہوں جن کے ذریعہ بغیر
تار کے تمام دنیا سے خبریں آتی ہیں۔ کیونکہ یہ وائٹس
یعنی آلات بے تاریخ رسائی دہلی کے لال قلعہ میں کبھی نہ گڑ سکتے
اگر غدر نہ ہوتا۔ گویا وائٹس کے یہ کھمبے غدر دہلی کا ایک نظر آیتوالا نتیجہ ہیں۔
یہ کتاب غدر کا نتیجہ نام رکھتی ہے تو غدر کے نتیجہ کے نام ہی مناسب
ہونی چاہیے۔

حسن نظامی

غدر دہلی کی تاریخ

کا

بارِ صوال حصہ

غدر کا نتیجہ

مجھے ایک قلمی کتاب شمس العلماء مولانا ضیاء الدین احمد صاحب دیباچہ { مرحوم دہلوی کے صاحبزادہ سے ملی جو فارسی زبان میں تھی اور جس میں نواب غلام حسین خان صاحب نے سہ ماہی کے حالات غدر تحریر کیے ہیں۔ یہ کتاب دو سو صفحے سے زیادہ تھی کیونکہ قدیمی زمانہ کی طویل انشا پردازی اس کتاب میں استعمال کی گئی تھی۔ میں نے ترجمہ کرانے کے وقت صرف غدر کے حالات کے لیے عبارت آرائی ترک کر دی۔

میں نے اس سے پہلے گیارہ حصے غدر دہلی کی تاریخ کے لکھے اور شائع کئے ہیں پہلے حصہ کا نام بگمات کے آنسو۔ دوسرا انگریزوں کی بپتہ تیسرا محاصرہ دہلی کے خطوط تھا بہادر شاہ کا مقدمہ۔ پانچواں

گرفتار شدہ خطوط چھٹا غدر کے اخبار ساتواں غالب کا روزنامہ غدر
اٹھواں دہلی کی جان کنی زوں دہلی کا آخری سانس۔ دسواں غدر کی
صبح شام گیارہواں دہلی کی آخری شمع۔

جب اس فارسی کتاب کا اردو ترجمہ تیار ہوا تو میں نے نام رکھنے کے
متعلق عرصہ تک غور کیا تو پہلے غدر کی پچھانسیاں نام تجویز ہوا کیونکہ
اس میں پچھانسیوں کا ذکر زیادہ ہے۔

مگر کتاب پچھنے کو گئی تو اس نام پر اعتراض ہوا اس لئے
”غدر کا نتیجہ“

نام رکھ دیا گیا۔

امن کی قدر یہ کتاب اگرچہ ایک ایسے صاحب نے لکھی ہے جو برٹش

بعض جگہ برٹش گورنمنٹ کی حمایت میں ذرا مبالغہ بھی کیا ہے۔ تاہم انصاف

کی بات یہ ہے کہ اس کتاب کے پڑھنے سے دلوں میں امن پسندی پیدا

ہوتی ہے۔ اور پڑھنے والے کو یہ خیال ہوتا ہے کہ جب کسی ملک میں غدار

نسا دار بے امنی پیدا ہوتی ہے تو گناہ گار اور بے گناہ دونوں مصیبت میں

پھنس جاتے ہیں۔ اور شریر لوگ ذاتی عناد و حسد کی وجہ سے مرقع ملنے پر

بے گناہوں کو جان اور مال کا نقصان پہنچانے میں دریغ نہیں کرتے۔

چنانچہ اس کتاب کے مطالعہ سے معلوم ہوگا کہ بعض خود غرض مخبروں

نے برٹش حکام کو ان لوگوں کے متعلق باغی ہونے کی اطلاعاتیں دیں جنکو مصنف

کتاب بھی باوجود غیر خواہ گورنمنٹ ہونے کے باغی نہیں سمجھتے تھے۔

ہر حال میں غدر کی تاریخ کا یہ باب ہوا حصہ بھی اسی نیت سے شامل کرنا ہوا کہ

ہندوستان کے باشندے امن کی قدر کریں۔ اور بے امنی کے کاموں سے علیحدہ رہیں۔ اور اس کتاب کے واقعات ان کے دل و دماغ پر امن پسندی کا اثر پیدا کریں ۰۰

نئی معلومات میں نے اس کتاب کے ساتھ حاشیہ پر کہیں کہیں نئی معلومات کے نوٹ بھی لکھے ہیں۔ اور یہ بھی کوشش کی ہے کہ چھاپنی پانے والے اشخاص کی اولاد میں اگر آج کل کوئی باقی ہو تو ان کا ذکر بھی اس کتاب میں آجائے۔ اس کی تحقیقات میں مجھے بہت محنت کرنی پڑی کیونکہ اب غدر کے زمانہ کے بہت تھوڑے آدمی باقی رہ گئے ہیں اور جو باقی ہیں وہ زیادہ واقف نہیں ہیں۔ مجھ کو مشکل دو چار آدمی ایسے ملے جنہوں نے پچانسی یافتہ اشخاص کے متعلق کچھ باتیں بتائیں۔ پھر بھی کئی نام ایسے رہ گئے جن کی نسبت مجھے کچھ معلوم نہ ہو سکا۔ کہ وہ کون تھے۔ اور ان کے پس ماندوں میں کوئی اب بھی باقی ہے یا نہیں ۰۰

مصنف پر غلبہ ذاتیات میں اس کتاب کے مصنف کی تعریف کرتا ہوں کہ ان کی اس کتاب سے ہم لوگوں کو اور آئندہ نسلوں کو ان حالات کا علم ہو گیا جو پہلے نہ کسی تاریخ میں تھے نہ سب کو معلوم تھے۔ لیکن اس کے ساتھ ہی اس بات کا افسوس ہے کہ مصنف نے بعض مخبروں کا تذکرہ کرتے وقت غالباً ذاتی اسباب کی بنا پر اپنے خاندان کے چند افراد کا نام بھی لکھ دیا۔ جن کی نسبت ذاتی طور سے مجھے معلوم ہے کہ وہ بے گناہ تھے۔ یعنی انھوں نے ہندوستانیوں کی مخبری نہیں کی۔ اور ان کو یہاں نہیں دلوایں۔ اُن میں سے ایک شخص ایسے بھی تھے جو آخر زمانہ میں دہلی کی سکونت ترک کر کے میرے ہاں دگاہ شریف میں آ گئے تھے اور یہاں انھوں نے ایک

مکان بنا لیا تھا اور اس میں رات دن رہتے تھے۔ اور میں بچپن میں ان کے پاس کھلا کرتا تھا۔ ان کی عبادت اور ان کی برہنہ کاری اور ان کے چہرے کا نورانیت میری آنکھوں کے سامنے ہے مگر مصنف نے بہت زیادہ زور انہی کے خلاف دیا ہے کہ انھوں نے مخبریاں کیں اور بے گناہوں کو پھانسیاں دلوائیں۔ چونکہ مجھے اس بیان کا یقین نہیں تھا اور ذاتی طور سے پورا اطمینان تھا کہ یہ واقعہ غلط ہے اس واسطے میں نے اس حصہ کو کتاب سے خارج کر دیا لیکن خارج کرنے سے پہلے ان کے پوتے سے جو ایک ریاست میں ایک بڑے عہدہ دار ہیں۔ کتاب کے مذکورہ اندراج کے متعلق خط لکھ کر حالات دریافت کئے۔ اور ان صاحب نے بھی میری رائے کی تصدیق کی۔ جس سے مجھے پورا اطمینان ہو گیا کہ مصنف کتاب نے یہ باتیں ذاتی اسباب کی بنا پر لکھی ہیں گی۔

اس تذکرہ کے خارج کر دینے سے کتاب کے تسلسل بیان اور واقعات کی تفصیل میں کوئی فرق نہیں آیا۔ کیونکہ میں نے ان اصلی مخبروں کے نام باقی رکھے ہیں جو حقیقت مخبری کا کام کرتے تھے۔

مصنف نے جن صاحب کی مخبری پر بہت زور دیا ہے ان کے بارہ میں تحقیق سے ظاہر ہوا کہ وہ تو خود شتمہ ہو کر برٹش افسروں کے ہاتھوں گرفتار ہوئے تھے اور بعد میں ان کو رہائی دی گئی تھی۔ اگر یہ مخبری والی بات سچی ہوتی تو ان کو کوئی انعام دیا جاتا۔ نہ کہ ان کو گرفتار کیا جاتا۔

بس اس مختصر ہتھکڑی کے بعد اب ناظرین کو اصل کتاب پڑھنی چاہیے اور یہ بات ملحوظ رکھنی چاہیے کہ کتاب کے مصنف برٹش گورنمنٹ کے خیر خواہ تھے اس لئے انھوں نے بعض الفاظ اہل عذر کی نسبت ایسے استعمال کیے ہیں جو موجودہ زمانہ کے ہندوستانیوں کو غالباً ناگوار ہوں گے۔ مگر میں نے ان کی تبدیلی اپنے

فرائض سے باہر سمجھی۔ اس واسطے ان کو صلی حالت پر قائم رہنے دیا۔
واقعات سچے ہیں { ایک شخص کی نسبت خلاف بیانی نظاہر ہونے سے یہ خیال نہ کرنا چاہیے کہ باقی حالات کبھی ایسے ہی بے اعتبار ہوں گے۔ کیونکہ مصنف نے اکثر حالات وہ لکھے ہیں جن کی تصدیق انگریزی تاریخوں اور خود میری لکھی ہوئی کتابوں سے ہوتی ہے۔ اور میں یقین کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ مصنف غلط نویس نہیں ہے۔
 البتہ خاندانی اختلافات کی بنا پر یا کسی اور وجہ سے ایک نامور اور معتبر بڑے آدمی کو کبھی انھوں نے مخبر بنا دیا۔ جو مصنف کے قریبی رشتہ دار بھی ہے۔

حسن نظمی دہلوی

۲۲ مئی ۱۹۳۰ء

•)) :||

کتاب کے آخر میں ان اشخاص کے حالات
کا اضافہ کر دیا گیا ہے جن کا مجمل ذکر مصنف کتاب
نے کیا ہے اور جس کی تحقیقات میں نے بعد میں کی۔
جولائی ۱۹۳۰ء حسن نظامی

مولف کے ذاتی حالات { میں غلام حسین خان خلیفہ نواب غلام حسن خان
اور کتاب لکھنے کی وجہ { لکھنے کا کتاب نہ لکھتا ہوں کہ لا روڈ
نواب فیض اللہ بیگ خان کو سنہ ۱۸۵۰ء میں علاقہ میوات کے تمام محلات بذریعہ
کے واسطے سپرد کئے تھے تین سال کے بعد سنہ ۱۸۵۲ء میں خدمت گزاری کے صلہ
میں میرے دادا صاحب مرحوم کو برگزیدہ تین تاجدار حیات بطور استمراری عطا کیا
گیا دادا صاحب کے انتقال کے بعد بموجب معاہدہ برگزیدہ ہم سے نکال لیا گیا اور
پس ماندگان کے واسطے ایک ہزار روپیہ پنشن مقرر کر دی گئی۔ میرے والد کو تین سو
روپیہ علیحدہ ملتے تھے۔ والد صاحب کے انتقال کے بعد اگر وہ کلفٹن کو برہادر نے
ہماری خیر خواہی اور کثیر الادائی اور خانہ بادی پر رحم فرما کر جون سنہ ۱۸۵۵ء
میں سو روپیہ پنشن میری مقرر کر دی ہم لوگ اپنی آبر و سنبھالے ہوئے اس پنشن
میں گزر کرتے تھے۔ ۹ مئی سنہ ۱۸۵۵ء کو ہفتہ کے دن اکھنڈی میں ولایت سے حکم
آیا کہ آٹھ سو روپے جو والد مرحوم کے انتقال کے بعد آٹھ ماہ تک مجھے کو نہیں ملے تھے

۱۰ نواب میرزا خضر صاحب پیشتر تحصیل دار سے معلوم ہوا کہ اس کتاب کے مصنف نواب غلام
حسین خان نواب غلام حسن خان صاحب کے بیٹے تھے۔ ان کی والدہ کا نام سنگی تھا جو طائف تہیں اور
نواب غلام حسین خان صاحب نواب فیض اللہ بیگ خان صاحب کے بیٹے تھے۔ نواب فیض اللہ بیگ خان
صاحب کے دوسرے پوتے نواب خضر صاحب ہیں۔ جو آج کل میرے ہاں درگاہ حضرت
خواجہ نظام الدین اولیاء میں یا د الہی کرتے ہیں۔ نواب خضر صاحب عرصہ تک میوات تحصیل دار
رہے۔ ان کے ایک بیٹے میرزا شاکر حسین صاحب پتھرا میں سیر سڑی کرتے ہیں۔ اور ایک بیٹے فوج
میں ایک بڑے عہدہ پر ہیں۔ آن کے دادا نواب میرزا فیض اللہ بیگ خان کا مزار میرے
مکان ایمان خانہ کے شرق میں ہے جس کے سرٹانے ابھی سر محمد رفیع صاحب دفن ہوئے ہیں۔ حسن نظامی

دیدئے جائیں ہفتہ کے دن اکیبٹی میں یہ حکم آیا دوسرے روز چونکہ اتوار تھا اور وفاتر وغیرہ بند تھے اس وجہ سے یہ حکم میرے پاس نہیں پہونچا امید تھی کہ کل دوشنبہ کے دن حکم ہمارے پاس پہنچ جائے گا اور وہ آٹھ سو روپے بھی ہم کو مل جائیگے کہ ایک دم تلنگوں کی فوج نے لارمنی ۱۸۵۷ء کو دوشنبہ کے دن دہلی پہونچ کر بلوکہ کر دیا اور بلائے آسمانی کی طرح سب کو مصیبت میں مبتلا کر دیا اور چار مہینہ چار دن لڑائی جھگڑے میں گزار دیئے آخر شرمندہ ہو کر یہ لوگ دہلی سے پورب کی طرف جہاں کے یہ نمک حرام رہنے والے تھے چلے گئے ان لوگوں نے راستہ میں سینکڑوں دیہات اور قصبات کو تباہ و برباد کر دیا میرے خیال میں آیا کہ میں ایسے ہنگامہ کا حال لکھ کر اس کتاب کو جس کا نام ”نصرت نامہ گو فمٹ“ ہے بطور یادگار چھوڑوں۔ اس واسطے میں نے یہ کتاب تیار کر دی ۔۶

— — — — —

غدر کی ابتدا ۱۸۵۷ء کو انیسویں جمبٹ میں جو چھاؤنی برم پور علاقہ مرث آباد میں مقیم تھی اچانک کارتوس کاٹنے پر جھگڑا ہوا۔ سرکار انگریزی نے اس بنا پر جمبٹ برنچ کے مجدار اور ایک سپاہی کو پھانسی دے دی اور باقی جمبٹ سے نافرمانی کے جرم میں تیار رکھوائے اور اس کی تنخواہ دے کر اس کو برطرف کر دیا۔ یہ لوگ جمبٹ سے طرف ہو کر اطراف و جوانب میں پھیل گئے اور جہاں جہاں تلنگوں کی فوج تھی وہاں پہونچ کر سپاہیوں کو وطن دشینے سے فساد پر آمادہ کیا اور ان سبے متفق ہو کر دہلی کا رخ کیا۔ ۱۸۵۷ء غدر دہلی کے زمانہ میں باغیوں کو تلنگا۔ اور تلنگے کہا جاتا تھا اور اسکی وجہ غالباً یہ ہوگی کہ ان کے افسر ملک تلنگا نہ دکن کے باشندے ہونگے ورنہ باغی لوگ عموماً برہمن (ممالک دھرم سیکند) کے رہنے والے تھے۔ اور ان کو پور یہ بھی کہتے تھے۔ انگریزی فوج والوں کو خاکی کہا جاتا تھا کیونکہ ان کی درویاں خاکی رنگ کی تھیں۔ حسن نظامی

سیاست دانوں کا خیال ہے کہ یہ تمام ہنگامہ اودھ کی بربادی کے باعث جو ان لوگوں کا وطن تھا ہوا۔ اس کے علاوہ جب گوردوں کی فوج لکھنؤ کی تسخیر کیو سبطے بھی گئی تو ان تلنگوں کو خبر نہیں کی گئی یہ بھی ایک بڑی وجہ ان کی بددلی اور شورش کی ہو سکتی ہے نیز یہ بھی خیال ہوتا ہے کہ اس میں لکھنؤ کے معزول بادشاہ واجد علی شاہ کا بھی ہاتھ تھا کیونکہ یہ سب لوگ اودھ کے رہنے والے انہیں کی رعایا تھے لیکن بظاہر کارٹوس کاٹنے کا قصہ مشہور کیا گیا ورنہ یہ کارٹوس کا جھگڑا کوئی ایسا اہم قصہ نہ تھا کہ حکام اسکی وجہ سے ایسی سختی برتتے اور ایسی عمدہ فوج کو جو کروڑوں روپیہ صرف کر کے تیار کی گئی تھی اس طرح ایک معمولی سی بات پر ضائع کر دیتے چونکہ تلنگوں کی فوج میں زیادہ تر چھوٹی قوموں کے لوگ تھے اسوجہ سے ان سے ایسی حرکتیں سرزد ہوئیں اگر اسی وقت گوردوں کے ساتھ ان کو بھی شریک لیا جاتا تو غالباً یہ صورت پیش نہ آتی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ جب اکثر لوگ بغاوت پر آمادہ ہوئے تو پھر باقی جو اس خیال کے نہیں تھے وہ بھی اوروں کی دیکھا دیکھی چارونا چار بنائو میں شریک ہو گئے۔ الغرض جب تمام فوج جہاں جہاں چھاؤنی میں متعین تھی فساد پر آمادہ ہو گئی تو سب سے پہلے میرٹھ کی چھاؤنی کی فوج نے۔ ارمی سہ ماہ کو فساد شروع کیا۔ فساد کی ابتدا اس طرح ہوئی کہ فساد سے ایک دن پہلے کرنیل نے انسٹی سواروں کو کارٹوس کاٹنے کا حکم دیا۔ سواروں نے انکار کیا۔ حکم عدولی کے جرم میں چودہ چودہ برس کی قید کی سزا ان سواروں کو دی گئی۔ دوسرے لوگوں کو خیال ہوا کہ آج ان کو جیل بھیجا گیا ہے کل کو یہی دن ہمارے لئے رکھا ہے اس وجہ سے

۳۷ مصنف نے غدر کے جو اسباب لکھے ہیں وہ یک طرفہ اور ناقص ہیں۔ سر سید خان صاحب نے "اسباب بغاوت ہند" کے نام سے جو کتاب لکھی تھی اس میں انگریزوں کی بعض غلطیوں کو مذکور کا باعث قرار دیا تھا۔ یہ کتاب ڈیوٹی کتاب علی گڑھ سے مل سکتی ہے۔ حسن نظامی

تسلکوں کی ماپٹ ملٹن کو ملا لیا اور غدر کر دیا جب بلوہ شروع ہو گیا تو پھر شہر کے لوگ بھی اس میں شریک ہو گئے مگر پھر شہر والے باغیوں سے علیحدہ ہو گئے اور باغیوں نے جیل خانہ توڑ کر قیدیوں کو رہا کر دیا اور کوٹھیوں اور بنگلوں میں آگ لگانی شروع کر دی میرٹھ کی اس کارروائی کے بعد یہ لوگ اسی رات کو دہلی کی طرف روانہ ہو گئے اور ارمی کی صفحہ کو ایک آفت ناگھانی کی طرح قلعہ دہلی کے بھروسہ کے پیچھے پہنچ کر ابلگھاٹ دروازہ سے شہر میں داخل ہو گئے۔ حکام کو جیب اسکی اطلاع ہوئی تو سب اس ہنگامہ کو روکنے کا کام کرنے لگے۔

کہا جاتا ہے کہ میرٹھ کے انگریزوں نے اس فساد کے واقعات کی اطلاع بذریعہ خط دہلی کے کمشنر مین صاحب بہادر کو کر دی تھی اور خط بلوائیوں کے شہر میں داخل ہونے سے پہلے کمشنر صاحب بہادر کے پاس آدھی رات کو پہنچ گیا تھا لیکن کمشنر صاحب نے وہ خط بغیر پڑھے ہوئے اپنی جیب میں ڈال لیا اور کسی کو خبر نہیں کی ورنہ وہی وقت انتظام کا اچھا تھا۔ اگر ان لوگوں کے شہر میں داخل ہونے سے پہلے ہی انتظام کر لیا جاتا تو یہ تباہی و بربادی پیدا نہ ہوتی مگر مجھ کو اس بات کا یقین نہیں ہے کیونکہ اول تو اتنے بڑے ہنگامہ کی خبر میرٹھ سے بذریعہ تار کمشنر صاحب کو دی جاتی اور اگرچہ خلاف وقت بھی پہنچی تھی پھر بھی ایک ذمہ دار افسر سے یہ بعید ہے کہ وہ اتنے بڑے ہنگامہ کی خبر پا کر چپ چاپ بیٹھا رہے اور کوئی انتظام نہ کرے اس کے علاوہ جنرل ہیوٹ صاحب جو میرٹھ کے کمپ میں تھے ان کی بھی تحریر میں کہیں اس امر کا پتہ نہیں چلتا کہ کوئی خط وہاں سے بھیجا گیا تھا ہے

میرٹھ کی چھٹی کی مفصل بحث میں نے تاریخ غدر دہلی کے آٹھویں حصہ دہلی کی جنگ میں لکھ دی ہے۔ اس میں اختلاف ہے۔ بعض کہتے ہیں خط پڑھا۔ بعض کہتے ہیں شراب کے نشہ کے سبب نہیں پڑھا۔ حسن نظامی ..

بلوائی میرٹھ سے آٹھ بجے دن کے فرار ہو کر دیائے جہنا کے پل سے اس پار
 چوکی پر حملہ آور ہوئے۔ داروغہ پل نے اس واقعہ کی اطلاع اسی وقت انسین صاحب
 بہاؤ مجسٹریٹ کو دی صاحب موصوف اسی وقت ان لوگوں کو سمجھانے کے لئے
 پل پر تشریف لے گئے جناب سیمین فریزر صاحب اس وقت گر جائیں نماز پڑھنے
 گئے ہوئے تھے جب ان کو اسکی اطلاع ہوئی تو وہ بھی موقع پر پہنچ گئے اور بلوائیوں
 کو سمجھانا چاہا لیکن ان کی فہمائش کا کوئی اثر ان پر نہ ہوا۔ بروقت صاحب موصوف
 کو یہ تدبیر سوچ گئی کہ انھوں نے کشتیوں کا پل توڑ دیا اور کشتیاں ہٹالیں یہ تدبیر
 کارگر ہوئی اور بلوائیوں کا داخلہ رک گیا۔ صاحب موصوف اسی انتظام میں مشغول
 تھے کہ کچھ لوگ جس طرف سے دریا پایاب تھا شہر میں داخل ہو گئے اور بلا امتیاز
 کے کہ سودا گروں کی کوٹھیاں ہیں یا انگریزوں کی ہیں آگ لگانی شروع کر دی اور
 لوگوں کے جان و مال کو نقصان پہنچانے لگے۔ ان کا سب سے پہلا مقابلہ سیمین صاحب
 بہاؤ مجسٹریٹ و گلشن صاحب بہادر سکریٹری اور ایچ انسین صاحب بہاؤ مجسٹریٹ
 سے ہوا جبکہ یہ تینوں متفقہ طور پر شہر کے انتظام میں مصروف تھے۔ جن میں سے دو
 اول الذکر پادری صاحب کے ساتھ میگزین میں جا رہے تھے کہ مرزا جان بخت کے
 ارہلی مسمی مغل اور اللہ داد خان دلائی خاصہ بردار نے زمین میں ان کو قتل کر دیا اور
 اوپر جا کر پادری صاحب کی دونوں لڑکیوں کو بھی مار ڈالا۔ یہ بھی روایت ہے کہ کمشنر حفص
 بہاؤ نے ایک فیر ٹمپنچ کا ایک ترک سوار پر کیا تھا جس سے وہ ہلاک ہو گیا تھا بس پھر
 کیا تھا یہ لوگ پل پڑے اور تینوں انگریزوں کا تلوار سے کام تمام کر دیا۔ اور بلا امتیاز
 دلائی اور کرانی عورتوں اور بچوں کو بھی تلوار کے گھاٹ اتارنا شروع کر دیا ۵

۵ اس قتل و ہنگامہ کی پوری تفصیل میری کتاب ”تاریخ غدر دہلی کے چوتھے حصہ
 بہادر شاہ کا مقدمہ“ اور پانچویں حصہ میں درج ہے۔ حسن نظامی

جب اس واقعہ کی اطلاع چارلس لباس صاحب بہادر جمع دہلی اور مرہٹے صاحب بہادر کلکٹر پرمٹ کو پہونچی تو یہ لوگ کشمیری دروازہ کے نیم گارو کے موقتہ پر پہونچ کر ٹھہرے کہ اس اثنا میں تلنگوں کی پلٹن مائپٹ محلہ افسروں کے مسلح ہو کر نیم گارو پر پہونچی اس وقت کرنل صاحب پلٹن نے پلٹن کے سپاہیوں سے نرمی اور چالوسی سے کہا کہ یہ وقت سرکار کی خیر خواہی کا ہے اور یہی وقت ہے کہ حق ٹھک ادا کرتے ہوئے دل و جان سے سرکار کی مدد کی جائے تاکہ اس کے صلہ میں انعام و اکرام کے مستحق ہو جاؤ۔ پلٹن کے سپاہیوں نے وفاداری کا پختہ عہد کیا اور قسم کھائی کہ ہم سب سرکار کے خیر خواہ رہیں گے ہر چند کہ کرنل صاحب کو ان کی اس قسم کا اعتبار نہیں تھا لیکن کرتے بھی تو کیا کرتے مجبوراً بذات خود سوار ہو کر باپج کا حکم پلٹن کو دیا جب صاحب موصوف گر جا کے قریب پہونچے تو چند سواروں نے بندوق کے فائر کئے جس سے ایک ہلکا سا زخم پلٹن کے اجیشن کے آگے صاحب موصوف نے فیر کا فوراً حکم دیا لیکن پلٹن والوں نے فیر کرنے سے انکار کر دیا یہ حالت دیکھ کر پلٹن کے انگریز باؤنڈر پر چلے آئے اور لباس صاحب اور مرہٹے صاحب نیز دیگر انگریز بھی باؤنڈر پر پہونچ گئے اسی درمیان میں الگنڈر پلٹن تیار ہو کر باؤنڈر پہونچ گئے فوج کے افسروں نے باوجود اس قدر شورش دیکھنے کے پھر بھی تین گنبدہ مستقل طور پر فہمائش کی لیکن جب ان کو یقین ہو گیا کہ ان لوگوں کے دلوں پر سمجھانے کا کوئی اثر نہ ہوگا تو مجبور ہو کر کرنال۔ پانی پت۔ شملہ وغیرہ کی طرف روانہ ہو گئے اور منزل مقصود پر پہونچ کر انتقام اور سزا دہی کی تدابیر کرنے لگے۔ انہیں لوگوں میں سے جان مشکاف صاحب جنٹ مجسٹریٹ دہلی بلوہ کے دن تہنا گھوڑے پر سوار پانچویں ننگی تلوار لیے شہر سے باہر نکلے اور ان ظالموں سے کچھ بچا ستے پہاڑ گج کے تھکانہ میں پہونچے۔ مرزا حسین الدین خان کھانے دار نے صاحب موصوف کو لپٹے بدلو کر

اور تبدیل ہیت کر کے بہنورا نمبر دار گلابی باغ کے پاس پہونچا دیا نمبر دار مذکور نے حنا موصوف کو پہلے تو درگاہ حضرت سید حسن رسول ناراضہ میں پہونچایا اور پھر پوشیدہ طور پر ایک محفوظ جگہ میں رکھا اور صاحب کے کھانے پینے کا انتظام کر دیا۔ پھر چند دن کے بعد صاحب موصوف کو جھجر پہونچا دیا لیکن وانی جھجر نے تلنگوں کے خوف سے صاحب موصوف کو اپنے ہاں پناہ نہیں دی بلکہ ملاقات بھی نہیں کی ایک بیان یہ بھی ہے کہ ملاقات تو کی لیکن جیسا کہ چاہئے تھا اخلاق و مروت سے کام نہیں لیا بلکہ جھجر میں ٹھہرنے بھی نہیں دیا۔ مثکاف صاحب نے جب یہ سرد مہری اور بے اعتنائی دیکھی تو وہ وہاں سے رنجیدہ ہو کر چلے گئے۔ عجیب زمانہ ہے کہ رئیس جھجر کو یہ ریاست سرساغلس مثکاف صاحب بہادر کی کوشش سے ملی تھی۔ لیکن انھوں نے اپنے محسن کے بیٹے کے ساتھ یہ سلوک کیا آخر اس کا نتیجہ جھگڑا۔

اب تلنگوں کا حال سنئے۔ تلنگوں کے ساتھ سینکڑوں چار اور دہنیے جلاہے مفلس تلاش ہو گئے اور ان سب نے مل کر تمام کو ٹھیوں نہک خزانہ اور تمام دفاتر اور کچہری کشتری و فوجداری اور کچہری صدر الصدور و مضفی وغیرہ کو آگ لگا دی اور تمام نقد جنس جو کچھ ہاتھ لگائے گئے۔ اور کاغذات مالی اور ملکی سب پھاڑ ڈالے دو سر کام یہ کیا کہ شیشے کی لال ٹینیں جو سڑکوں پر لگی ہوئی تھیں توڑ پھوڑ کر پھینک دیں اور ان کی لکڑیاں زمین سے اکھاڑ کر تمام شہر کو روشنی سے محروم کر دیا اور ہر طرف اندھیرا چھا گیا۔ ان لوگوں نے تمام شہر اور قلعہ کو گھیر لیا اور میگروینز اور قلعہ کے ریازوں پر قبضہ کر کے ہر جگہ اپنا پو کی پہرہ لگا دیا جب میگروین پر تلنگوں نے قبضہ کیا تو اس وقت ایک عجیب حادثہ پیش آیا چند انگریز میگروین کے ایک ہرج میں تھے جنہیں بارود سپی بھرے ہوئے تھے وہ میگروین اڑ گیا اور ایلیسی ہیبت ناک نازہنی تہ تمام کاٹا شہر کے مل گئے اور لوگوں کو دل کانپ گئے۔ میگروین کے اڑنے سے پتھر وغیرہ ایسے اڑے کہ اسکے صدقے

تقریباً چھ سو آدمی ہلاک ہو گئے۔ رجب رات ہرنی تو تلنگوں کی اور دو پلٹیں جو زیر آباد کی چھاؤنی میں متعین تھیں دہلی میں داخل ہوئیں ان کی سلامی میں گیارہ توپیں چلائی گئیں اور یہ سب مل کر ایک ہو گئے اور پھر سب نے مل کر دروازوں اور قلعہ کی نگہبانی اور اطراف و جانب کی نگہبانی وغیرہ کا بندوبست شروع کیا اسی رات شہر کے بدعاشوں نے چند نقلی تلنگوں کو ساتھ لے کر شہر کو لوٹنا شروع کر دیا اور ساہوکاروں وغیرہ کا مال و اسباب ظلم سے لوٹ لیا اور پھر لوٹ کے بعد مخبری کا پیشہ اختیار کر لیا۔

الغرض جب صبح ہوئی تو تلنگوں کے کہنے سے بادشاہ کی سواری محلہ شانہ اڑوں کے چاندنی چوک میں بیگم کے باغ کے دروازہ پر پہنچی بادشاہ نے فوج سے مخاطب ہو کر فرمایا کہ میں جان و مال سے تمہارے ساتھ ہوں لیکن نہ میرے پاس خزانہ ہے نہ فوج نہ ملک البتہ جب میرا ملک مجھ کو مل جائے گا تو میں تم کو بھی عنایت خسروانہ سے سرفراز کروں گا۔ ان لوگوں نے عرض کی کہ نہ ہم مال کے خواہاں ہیں نہ فوج چاہتے ہیں ہمارا مقصد تو صرف اتنا ہے کہ بندگانِ عالی ہماری سرپرستی فرمائیں ہم لوگ اپنا سر حضور کے قدموں پر نثار کرنے کے واسطے تیار ہیں اور چاہتے ہیں کہ تمام ہندوستان میں حضور کی سلطنت قائم کر کے ابدی نیک نامی حاصل کریں بادشاہ نے جواب میں فرمایا تم جو کچھ کہتے ہو میری بھی دینی آرزو یہی ہے جو کچھ میرے پاس ہے وہ تمہارے واسطے موجود ہے اسکو کھائیے پیو اور ہمت کر کے مخالفوں کو نکال دو اور میرا سکھ جا ہی کر دو۔ قریب شام بادشاہ کی واپسی قلعہ میں ہوئی قلعہ میں پہنچ کر بادشاہ نے ارکانِ دولت سے مشورہ کیا ہر شخص نے اپنے حوصلہ اور عقل کے مناسب بمقتضائے وقت رائے دی آخر اسی صلاح و مشورے میں صبح ہو گئی۔

صبح کو بادشاہ نے دیوان خاص میں دربار کیا اور باغی فوج کے تمام افسران

دربار میں حاضر ہوئے اور انتظام ملکی اور سامان جنگ و رسد وغیرہ کے واسطے عرض کیا۔ بادشاہ نے فرمایا میرے جتنے نوکر چاہیں سب تمہارے ہیں تم سب ملکر جس طرح مناسب وقت سمجھو عمل کرو۔ بظاہر تو لوگ بہت کچھ شینیاں بگھارتے تھے لیکن حقیقتہً انجام کے خوف سے ہر شخص پریشان تھا اور سب کے چہروں پر ہراسیاں اڑ رہی تھیں۔

شام کے قریب باغی لوگ ساٹھ انگریز عورتوں اور بچوں کو گرفتار کر کے لائے اور قیدیوں کی طرح بادشاہ کے سامنے پیش کیا۔ بادشاہ نے فرمایا کہ ہمارے مذہب میں عورتوں اور بچوں کو قتل کرنا سخت گناہ ہے۔ ان کو قلعہ کے جیل خانہ میں تہا آرام سے رکھا جائے اور ان کے کھانے پینے کی پورے طور پر خبر گیری کی جائے یہ لوگ ایک شبانہ روز قید میں رہے تیسرے روز تلنگوں نے ان قیدیوں کو قتل کرنے کے واسطے طلب کیا۔ بادشاہ نے ہر خیزان کے قتل سے روکا۔ لیکن ان سنگ دلوں نے ایک نہ سنی اور ان سب کو جیل خانہ سے نکال کر قلعہ کے نقا خانہ کے نیچے کھڑا کر کے گولیوں اور تلواروں سے قتل کر دیا اور ذرا بھی خوف خدا نہیں کیا لوگ ان کی اس ستقاوت قلبی اور بے رحمی سے سخت متعجب ہو گئے اور گالیاں دیتے تھے اس روز سے ان کم بختوں نے یہ ظلم اختیار کیا کہ جس کے گھر میں چاہتے تھے۔ گھس پڑتے تھے اور بہانہ یہ کرتے تھے کہ تمہارے گھر میں انگریز چھپے ہوئے ہیں۔ اس بہانہ سے لوگوں کے گھروں میں گھس کر تمام مال و اسباب لوٹ لاتے تھے۔ چنانچہ اسی طرح مئی کی ۱۳ تاریخ کو یہ باغی منشی موہن لال صاحب عرف آغا حسن جان صاحب کے قتل کرنے کو جو سرکار انگریزی کے قدیم خیر خواہ ہیں ان کے حالات کی پوری تفصیل معلوم نہیں ہوئی لیکن ہے اس کتاب کے آخر میں پورے حالات درج ہو سکیں گے کہ میں نے متعدد واقف کار حضرات کو لکھا ہے۔ ان کے جوابات ابھی نہیں آئے۔ اور کتاب لکھنے کو دے دی ہے۔ حسن نظامی

ان کے گھر میں گھس گئے اور ان کو پکڑ لائے اور چاہتے تھے کہ ان کو قتل کر دیں کہ تمام محلہ والے جمع ہو گئے اور ان کو اس حرکت سے روکا اور آخر تمام گھر کا مال و اسباب جان کا صدقہ مالی سمجھ کر لے گئے اور منشی صاحب کی جان بچ گئی۔ اسی طرح یہ لوگ ڈپٹی رام سرنداس مرحوم کے مکان میں بسے اور ان کا جتنا مال و اسباب تھا سب لوٹ لیا اور ڈپٹی صاحب کے بھائی ناظر گو بند سرن صاحب کے قتل پر آمادہ ہوئے بچارے ناظر صاحب جان کے خوف سے چھپ گئے آخر میاں نظام الدین صاحب خلیف میاں کلے صاحب نے جو بادشاہ کے پیر تھے اور ناظر صاحب سے قدیمی اتحاد رکھتے تھے اور ہم عمر و ہم وطن بھی تھے کوشش کر کے ناظر صاحب کی جان بچائی اور جو کچھ اسباب و زیور باقی تھا اسکو زمین میں گاڑ دیا لیکن ڈپٹی صاحب کے ٹھکانہ حرام کہا ر ملازموں نے اسکو ہر جگہ سے نکال لیا اور ناظر صاحب بچارے کے اور ان کے متعلقین کے پاس سوائے ان کپڑوں کے جو جسم پر تھے کچھ باقی نہ رہا۔ ناظر صاحب نے بڑی سختی اور تنگی سے یہ مصیبت کے دن بسر کئے جب انگریزوں کی عملداری ہوئی تو یہ بچارے پہاڑ گنج کے تہانہ دار کر دیئے گئے انھوں نے اس علاقہ کا بہت اچھا انتظام کیا اور سینکڑوں مجرموں کو گرفتار کیا ان کے حسن انتظام سے سب حکام خوش اور راضی رہے۔

عقل مند اور دور اندیش لوگ مصلحت و وقت دیکھ کر جو کام بھی کرتے ہیں وہ حکمت اور تدبیر سے خالی نہیں ہوتا ایسے لوگوں میں سے حکیم احسن اللہ خان اور بادشاہ کی خاص بیگم ذاب زینت محل بیگم صاحبہ بھی ہیں انھوں نے شاہی شہ کے ذریعہ اس ہنگامہ کی خبر لفٹنٹ گورنر آگرہ کو پہونچائی اور خفیہ طور پر خط و کتاب لفٹنٹ گورنر سے جاری رکھی۔ اس شاہی خط کے جواب میں لفٹنٹ گورنر نے اس

مضمون کا خط لکھا کہ ہم کو ان حالات کے سننے سے سخت رنج اور افسوس ہوا
 آپ لطیفان رکھیں ہم امید کرتے ہیں کہ عنقریب فساد کا انسداد ہو جائے گا۔
 لیکن چند روز کے بعد لفٹنٹ گورنر کو یہ معلوم ہوا کہ باغیوں کے ساتھ بادشاہ ہی
 ساز باز کہتے ہیں تو لفٹنٹ گورنر بہت برہم ہوئے اور بادشاہ کو ایک خط بہت سی
 شکایتوں کا تہدید آمیز لکھا بادشاہ نے بھی اس خط کا مناسب طریقہ سے جواب
 دیا چونکہ یہ سب معاملات خفیہ تھے اور یہ خط و کتابت بالکل پوشیدہ طور پر ہوئی تھی
 اس وجہ سے اس کے متعلق کوئی کافی معلومات حاصل نہیں ہو سکی۔ ہاں خیال
 یہی ہے کہ ضرور لفٹنٹ گورنر بادشاہ کی ان حرکات سے جو انھوں نے کوتاہ اندیشی
 سے کیں اور باغیوں کے ساتھ ساز باز کہنے پر برہم ہوئے اور بادشاہ کے دھڑکے
 خط کا جواب بھی خاطر خواہ نہ ملا ہو گا۔ افسوس اس کا ہے کہ اگر عمائدین شہر
 اور بڑے بڑے لوگ متفق ہو کر اس بلوہ کا انتظام کرتے تو یہ صورت پیش نہ
 آتی اور اس طرح لوگوں کی خانہ بربادی نہ ہوتی اور بادشاہ پر بھی کوئی الزام نہ آتا
 اب بادشاہ اور رعایا دونوں پر یہ اعتراض ہوتا ہے کہ اگر بادشاہ جس وقت
 بلوئیوں کی فوجیں آئی میں ان سے بالکل کنارہ کشی اختیار کر لیتے اور درگاہ
 حضرت خواجہ قطب الدین صاحب رضہ میں یا کسی اور جگہ چلے جاتے اور باغی
 فوج کو صاف جواب دے دیتے اور ان سے کوئی سرکار نہ رکھتے تو یہ بات
 کچھ دشوار نہ تھی لیکن افسوس اور صدا افسوس بادشاہ کی اور ان گھڑیوں کی
 عقل پر کہ ایسے انصاف پرور حاکموں کے ساتھ جو بادشاہ کو ایک لاکھ روپیہ
 لے مصنف کتاب نے ملکہ دینت محل اور حکیم احسن اللہ خان کی نسبت جو کچھ لکھا
 ہے وہ دہلی کی افواہیں کی بنا پر لکھا ہے ورنہ میری تحقیقات یہ ہے کہ ملکہ صاحبہ اور حکیم
 صاحب دونوں بے قصور تھے نہ انھوں نے کسی سے مخبری کی نہ بنا دت کی حمایت کی چہن نظامی

ماہانہ دیتے تھے اور ہر قسم کے آداب شاہانہ بجالاتے تھے۔ نیز لاکھوں روپے عمامہ
اور ساکنان شہر کو بلا کسی خدمت کے دیتے تھے بناوت کی اور یہ نہیں سمجھا کہ اس
عملداری کے سوا جس کو خدا قیامت تک قائم رکھے دوسری عملداری میں سوا
تباہی اور رسوائی کے کیا ہو گا۔

بادشاہ بوڑھے ہو چکے تھے اور عمر طبعی کو پہنچ گئے تھے ان کے لئے زیبا نہ
تھا کہ وہ اپنی جان کا اس قدر خوف کرتے اور دور اندیشی سے کام نہ لیتے۔

سرکار کمپنی بہادر کہ قدیمی محسن تھی اس کا خیال بالکل دل سے بھلا دینا اور
منافقوں کے ساتھ ہمہ تن شریک ہو جانا بالکل عقل و دانش کے خلاف تھا
میں تسلیم کرتا ہوں کہ باغیوں کی سپاہ بادشاہ کو قید کر لیتی یا قتل کر دیتی
لیکن اس صورت میں تیموری سلطنت کا نام ہمیشہ قائم رہتا اور سرکار انگریزی
بادشاہ اور رعایا کے ساتھ ایسی پرورش کرتی کہ باید و نشاید۔ لیکن مقدرات
نہیں بدلتے۔ تقدیر الہیوں ہی تھی کہ ہر شخص خام خیالی اور نا فہمی کے باعث اس
مستفق تھا کہ انگریزی عمل داری یک قلم صفحہ ہستی سے حرف غلط کی طرح مٹ گئی
کیونکہ سرکار انگریزی کی ڈاک سب طرف بند ہو گئی لوگوں کی یہ بھی بہت مضبوط دلیل
تھی کہ چونکہ سلطنت جنگی فوج اور خزانے اور سامان جنگ پر منحصر ہے اور یہ سب
چیزیں باغیوں کے ہاتھ میں ہیں تو سلطنت کس طرح رہ سکتی ہے مجھ کو تو یہ حیرت
ہے کہ ان لوگوں کی عقل کو کیا ہو گیا تھا کہ تھوڑی سی باغی فوج کے آجانے سے ایسا
ظاہری اور باطنی اطمینان چھل ہو گیا کہ بہت سے سرکاری ملازمین اور وظیفہ
خواروں نے سینکڑوں التجاؤں سے عہدہ داری کے لئے استدعا کی اور بادشاہی

لے مصنف کتاب ہذا کی اس رائے سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ اسباب بغاوت ہند سے یا تو
اچھی طرح واقف نہ تھے اور یا انھوں نے انکو کتنا مصلحت کے خلاف سمجھا اور یا وہ اس کتاب میں
اس قسم کے خیالات ظاہر کر کے کوئی ذاتی فائدہ چاہتے تھے۔ حسن نظامی

اہلکاروں کی خوشامد کے فوج روسیاء میں عہدوں پر مامور ہو گئے اور اپنے
آقاؤں کے ساتھ لڑائی کی ٹھکان لی۔

ملک کا انتظام تو فوج کی اطاعت اور بادشاہ کی سیاست دانی پر ہے۔
اور جس جگہ نہ فوج مطیع ہو نہ حکم سیاست داں وہاں کا انتظام کیا ہو سکتا ہے
اس کا انجام بدیہی ہی ہو گا ۰۰

۰۰ ۰۰ ۰۰ ۰۰ ۰۰

لوگوں کے بدخواہ اور دشمن جاسوسوں اور مخبروں نے حکیم صاحب اور حکیم
صاحب کی انگریزوں کے ساتھ خفیہ خط و کتابت کا حال باغی فوج سے بیان کر دیا
جب ان جاہلوں کو یہ راز معلوم ہو گیا تو یہ لوگ حکیم صاحب کے قتل کے ورپے
ہو گئے حکیم صاحب ایک بڑے صاحب عقل و فراست آدمی ہیں انھوں نے مجھ
لیا کہ باغی لوگ میرے ورپے آزار ہو گئے ہیں اس لیے پہلے تو انھوں نے قرآن مجید
ہاتھ میں لے کر قسم کھائی کہ میرا انگریزوں سے کوئی تعلق نہیں ہے اس کے بعد
کارخانجات اور فراہمی رسد وغیرہ کا انتظام جو ان کے متعلق تھا مرشد زادوں
کے سپرد کر کے گوشہ نشینی اختیار کر لی ۰۰ (شہزادوں کو مرشد زادہ کہتے تھے)

۰۰ ۰۰ ۰۰ ۰۰ ۰۰

دہلی سے انگریزوں کے
جانے کے بعد

چوتھے دن فوج اور ارکان دولت کی استدعا
پر شاہی پردانے رئیس مجھ پر ہمارے گڈھ راجہ
بلب گڈھ اور نواب دو جانہ و فرخ نگر راجہ جے پور
والور و گوالیار و بیجا پانی اور اور زو سا کے نام شتر سواروں کے ہاتھ روانہ کئے
گئے کہ وہ حاضر ہو کر بادشاہی فوج کی مدد کریں اور بذریعہ چوہدریوں کے جملہ
عمائدین و ساکنان شہر کو تاکید کی حکم دیا گیا کہ وہ روزانہ صبح و شام شاہی دربار

میں حاضر ہو کر میں شہر کے لوگ تلنگوں کے خوف اور اپنی جان و مال کے ڈر سے شاہی حکم کی تعمیل کرتے تھے اور صبح شام دربار میں حاضر ہوتے تھے لیکن نواب امین الدین احمد خان اور ضیاء الدین احمد خان فخر الدولہ نواب احمد بخش خان مرحوم جاگیر دار پرگنہ لوہارو کے بیٹے جو بڑے عقل مند اور سمجھ دار اور وظیفہ خوار سرکار کبھی بہادر کے ہیں کبھی خوشی سے لال قلمہ میں نہیں گئے۔ اگر بادشاہ چار مرتبہ بلاتے تھے تو یہ ایک مرتبہ جبراً قہراً حاضر ہوتے تھے بلکہ چند بار بادشاہ نے ان کی لیاقت اور کاروائی کی بنا پر فوج کے بندوبست اور انتظام ملک کے واسطے اپنی زبان سے فرمایا لیکن ان لوگوں نے عاجزی اور انکساری سے عذر کر کے انکار کر دیا اور کئی مرتبہ اپنے پرگنہ کو جلنے کی اجازت چاہی اور روانگی کے علاوہ سے اپنے بال بچوں کو لے کر شہر کے دروازہ تک گئے لیکن باوجود انتہائی منت و سماجت کے باغیوں کی فوج نے جو دروازہ پر تعینات تھی جانے نہ دیا بلکہ گالیوں دیں آخر مجبور ہو کر اپنے گھر کو لوٹ آئے۔ کئی بار ایسا ہوا کہ مرزا مغل اور افسران فوج نے نواب صاحب سے ہر در حکومت روپیہ طلب کیا لیکن نواب صاحب نے کبھی ایک کوڑی نہیں دی اور امر و فرما ہی کرتے رہے حتیٰ کہ ایک دن نوبت قساو اور کشت و خون کی پہونچ گئی یعنی نواب امین الدین احمد خان مع اپنے چھوٹے بھائی اور چند ملازمین کے حسب الطلب مرزا مغل کے دربار میں گئے ان کے پہونچتے ہی مرزا مغل نے نواب صاحب سے کہا کہ آپ روپیہ کیوں نہیں دیتے ہیں نواب صاحب نے جواب میں کہا کہ جیل کے گھونسلے میں ماس کہاں۔ میں تو سپاہی ہوں میرے پاس سوائے چند ٹپنجوں اور تلواروں اور ہاتھی گھوڑوں اونٹوں اور ملاک اور فرش اور کپڑوں کے کیا رکھا ہے آمدنی سے زیادہ میرا خرچ ہے قرضدار ہوں میرا پرگنہ سرکش ہے اور یک فصلہ ہے

میرے بال بچوں کا ہاتھ پکڑ کر گھر سے باہر نکال دیجئے اور میرا سب سامان ہاتھی گھوڑے اونٹ وغیرہ لے کر اپنے خرچ میں لائے اور مجھ کو خستہ و بچکے کہ میں اپنے پرگنہ پر جا کر اپنی اوقات بسر کی فکر کروں۔ دربار میں چند افسر تلنگوں کے بیٹھے تھے ان میں سے ایک افسر نے جو ہنایت جاہل تھا کھڑے ہو کر مرزا محل سے عرض کیا کہ اگر ہم کو حکم ہو تو ایک گمنام میں نواب صاحب سے روپیہ لے لیں۔

نواب صاحب ہمیشہ کے مغلوب الغضب آدمی ہیں ان کو اس بات کی ہر بات کہاں تھی اسکی یہ بات سننے ہی بولے کہ تجھ پر طلاق ہے اور تجھ کو کھانا پینا حرام ہے جو مجھ سے روپیہ نہ لے لے اور میرے گھر نہ آئے اور روپیہ نہ لے تیری کیسا حقیقت ہے کہ مجھے روپیہ لیکر جب نوبت یہاں تک پہنچی تو مرزا محل نے مناسب سمجھ کر دربار پر فراست کر دیا اور محل میں چلے گئے نواب صاحب وہاں سے اٹھ کر بادشاہ کے پاس گئے اور اس گفتگو کو دہرایا بادشاہ نے مرزا محل کو حکم بھیجا کہ فوج نواب صاحب سے روپیہ طلب نہ کرے۔ نواب صاحب وہاں سے خستہ ہو کر اپنے گھر چلے آئے اور نواب صاحب اور جان مٹکاف صاحب سے پہاڑی پر خط و کتابت جاری رہی اور ان کا انجام اچھا ہا۔ جب انگریزی لشکر فاتحانہ طور پر دہلی میں داخل ہوا تو اس وقت نواب صاحب موصوف مع اپنے بہائی اور دیگر متعلقین کے اپنا تمام سامان ہاتھی گھوڑے وغیرہ لے کر حضرت خواجہ قطب الدین بختیار کاکی رحمۃ اللہ علیہ کی درگاہ میں مقیم تھے جب انگریزی فوج وہاں پہنچی تو اس نے نواب صاحب کے ہاتھی گھوڑے وغیرہ لے لئے اس کے بعد تمام اسباب نقد و جنس اور کپڑے وغیرہ بھی لے گئے نواب صاحب بچارے انگریزی فوج والوں کے ہاتھوں تباہ و برباد ہو کر مع اپنے متعلقین کے فرخ نگر چلے گئے۔

وہ دن وہاں قیام کے ریاست دو جان نہ پہنچے اور وہاں سامان ضروری درست کر کے

کشنر صاحب کی طلبی پر مدلی کے قلعہ میں آئے کشنر صاحب کے ملاقات کے بعد ان کے حکم سے ایک مکان قلعہ میں پسند کر کے اس میں سکونت پذیر ہوئے چار مہینہ تک نواب صاحب قلعہ میں رہے۔ جب روجاری کے بعد سرکار انگریزی سے ان کی صفائی ہو گئی تو کشنر صاحب کے فرمانے کے بموجب قلعہ کے باہر نیچکی کے قریب ایک مکان کرایہ پر لے کر اس میں رہنے لگے اور ان کے مقدمہ کی رپورٹ جاگیر و املاک کی واکزاشت کے واسطے صدر میں بھیجی گئی پھر اگست ۱۸۵۷ء میں بموجب حکم گورنمنٹ پرگنہ لوہاروان کو واپس دیا گیا اور وہ یعنی نواب احمد الدین خان مدد اپنے بھائی کے اپنے علاقہ کے بندوبست کے واسطے چلے گئے۔

۔۔۔۔۔

بادشاہی شقوں کے جواب میں سرداروں اور جاگیرداروں کی عرضیاں اطراف و جوانب سے بدین مضمون موصول ہوئیں کہ ہم بوجہ بد امنی اور بد انتظامی کے اپنے علاقہ سے غیر حاضر نہیں ہو سکتے۔ البتہ جب یہ ہنگامہ فتنہ و فساد فرو ہو جائے گا اس وقت حاضر ہوں گے۔ یہ سب عرضیاں بادشاہ کے حضور پیش ہوئیں اور اکثر وہ لوگ جو شاہی شقے لے کر گئے تھے راستہ ہی میں قزاقوں اور ٹھگوں کے ہاتھوں ہلاک ہو گئے۔

۔۔۔۔۔

بہادر شاہ کا دربار | صبح کو بادشاہ دیوان خاص میں چاندی کی کرسی پر جلوہ فرما ہوئے۔ درباری اہلکار و مرشد زادے

اور امرائے نامدار اور عمائدین شہر اپنے اپنے قرینے سے کھڑے ہوئے۔ مرزا ظہیر الدین عرف مرزا مغل خلوت فاخرہ اور خطاب سپہ سالاری سے سرفراز کئے گئے۔

میرزا مغل بہادر شاہ کے بیٹے تھے۔ غدر کے زمانہ میں پٹانہ لائے گئے اور غدر کے بعد انگریزی افیسر مرہٹوں کے ہاتھ میں آئے۔

اور مرزا ابو بکر مرزا فخر و مرحوم کے بیٹے کو باغیوں کے کل سواروں کی افسری دی گئی
 مرزا خضر سلطان کو پلٹن ہاپٹ کی کرنیلی دی گئی اور محمد بختا ورشاہ الگنڈرا
 پلٹن کے کرنیل مقرر ہوئے۔ مرزا عبداللہ کو پلٹن ہیلی کی افسری ملی۔ اور مرزا
 قویا شس پلٹن کے کرنیل مقرر ہوئے اور مرزا عبداللہ سپر مرزا شاہ رخ مرحوم
 کو پلٹن جالیسبر کی کرنیلی محنت ہوئی۔ اور زینت محل صاحبہ نے بلم ٹیر پلٹن کو اپنی
 ماتحتی میں لیا۔ اور مرزا امیندھو پلٹن کین کی افسری پر متعین ہوئے۔ اور نواب
 محمد حسن خان مرزا خضر سلطان کے نائب ہوئے اور مرزا معین الدین حسن صاحب
 مرزا مغل کی نیابت میں مقرر ہوئے۔ اور میر نواب مرزا قویا شس کے نائب ہوئے۔
 اور میر نواب سپر میر فضل حسین وکیل سر رشتہ ہوئے اور میر فتح علی وزیر
 صحرائی یہ دونوں آدمی گورگناؤں اور گردھی ہر سرور کی طرف خزانہ لانے کے واسطے
 روانہ ہوئے اور یہ دونوں آدمی قریب چالیس ہزار روپیہ کے دونوں جگہ سے
 لائے اور اس خیر خواہی کی بنا پر سپہ سالار کی بارگاہ کے قصر میں داخل ہو گئے۔
 اور شاہزادہ محمد عظیم بن شہزادہ جہاں اختر کہ پہلے عہدہ اسٹنٹی پرمٹ پر
 بمقام سپر سرکار انگریزی کی طرف سے مقرر تھے اب بحکم بادشاہ دہلی ضلع سپر
 کے بند بست اور وہاں سے خزانہ لانے کے واسطے ایک پلٹن اور دو ضرب توپ
 اور میگنیزین وغیرہ لے کر سرسہ گئے ہوئے تھے۔ وہاں سے ناکام واپس آئے۔
 اثناء راہ میں انگریزی فوج سے مقابلہ بھی ہوا لیکن سوائے پسپائی کے ان سے
 اور کچھ نہ ہوا۔

دوسرے دن مرزا جواں بخت وزارت کے عہدہ پر سرفراز کئے گئے۔ اور

۱۰ میرزا جواں بخت بہادر شاہ کے لاڈلے بیٹے تھے۔ ملکہ زینت محل ان
 کی والدہ تھیں۔ ۱۰

حسن نظامی

نواب ولید اوخان رئیس مالاکڈہ تعلقہ وار ضلع بلند شہر جو بادشاہ دہلی کے قریبی شہر تھا تختہ خلعت اور نظامت صوبہ دوا آب سے مشرف ہونے اور راؤ صاحب پرگنہ داوری اور دھوم کو بادشاہ کی جانب سے خلعت اور خطاب اور نقارہ و نشانِ محبت ہوا اور خدمتِ رسدِ رسانی اور انتظامِ راہ شاہِ رہ سے مالاکڈہ تک کی سپرد کی گئی۔ اور مسیحی سائیکل انگریزوں کی رسد چھیننے کے لئے باغیت کے علاقہ پر تعینات ہوئے چند روز انھوں نے ہنگامہ جاری کیا لیکن کرم علی خان ڈپٹی کلکٹر کے ہاتھ سے مارے گئے ان کے بعد ان کا نواسہ ان کی جگہ پر مقرر ہوا اور یہ بہت دن تک لوٹ مار کرتا رہا فوج شاہی کے فراہ ہونے تک اسکی ڈاکر زنی جاری رہی ۱۰

ہر چند کہ مرشد زادے اور بعض عمائدین اپنی بے عقلی اور طمع نفسانی کی وجہ سے خلعت اور خطاب کے ملنے سے خوش تھے لیکن تمام عقل مند لوگ اس خلعت کو کفن ہی سمجھتے تھے۔

نواب ولید اوخان سندھ صوبے داری دوا آب لے کر ۲۶ مئی ۱۸۵۷ء کو بادشاہ سے اجازت لے کر چند سپاہیوں اور ملنگوں اور نگرہلوں کے ساتھ مالاکڈہ کی طرف روانہ ہو گئے۔ میں اور منشی موہن لال عرف آغا حسن جان بھی چونکہ ملنگوں کے رات دن کے مظالم سے تنگ آ گئے تھے اس لئے نواب صاحب مذکور کے ہمراہ روانہ ہو گئے ہر چند کہ آغا حسن جان قدیمی نمک خوار اور خیر خواہ سرکار انگریزی کے تھے اور میں بھی سرکاری وظیفہ خواہ ہوں ہم لوگوں کے واسطے یہ کسی طرح بھی مناسب نہیں تھا کہ ایسے بدخواہ اور دشمن سرکار انگریزی کے ساتھ جائیں لیکن چونکہ روانگی کے وقت نواب ولی داو خان نے قسم کھائی تھی اور عہد و پیمان کیا تھا کہ میں

سرکار انگریزی سے ہرگز انحراف نہیں کروں گا۔ ظاہر بادشاہ کا خیر خواہ رہوں گا لیکن دل سے انگریزوں کی خیر خواہی کروں گا۔ اس وجہ سے ہم لوگ ان کے عہد و پیمان پر بکھر دس کر کے ان کے ساتھ ہونے سے آخر کار پشیمانی اٹھانی پڑی۔

نواب صاحب مذکور راول غازی نگر پہنچے اور وہاں کا انتظام کیا وہاں کے تحصیلدار اور کھانا دار نے حاضر ہو کر نواب صاحب کو نذر گزرائی اور حکومت دہلی کی مبارکباد دی۔ نواب صاحب نے وہاں کا انتظام کر کے سو سپاہی سڑک کی نگہبانی اور قصبہ کے انتظام کے واسطے تحصیلدار اور کھانا دار کے متعلق کیئے اور سبھی ہریان علی خان اور مظفر علی خان کو مع ان کے دونوں بھائیوں کے جو امرتسر کے رہنے والے تھے سواروں میں رکھ کر ایک رات دن وہاں قیام کیا اور مذکورہ سواروں کو لے کر روانہ ہوئے ایک رات موضع داوری میں ٹہرے تیسرے دن شام کے قریب مالگڈھ میں داخل ہوئے اور دو روز کے بعد ہر پرشا و مختار کے ہاتھ ظاہری چا پلو سی سے آموں اور خرپوزوں۔ رنگتروں کی چند ڈالیاں سپلٹ صاحب کلکٹر ضلع بلند شہر کی خدمت میں بھیجیں ہر پرشا و مختار نے بعد نیم سلام وغیرہ کے ڈالیاں کلکٹر صاحب کو پیش کیں صاحب ممدوح نے نہایت خندہ پیشانی سے نواب صاحب کا حال پوچھا اور ڈالی قبول کر لی وہ دن کے بعد نواب صاحب منشی مرہن لال صاحب عرف آغا حسن جان اور محمد اسماعیل خان کو ہمراہ لے کر مع چند سواروں کے کلکٹر صاحب سے ملاقات کرنے کو گئے ایک باغ میں جو بلند شہر سے متصل تھا دونوں کی ملاقات ہوئی نواب صاحب نے دیر میں پہنچنے کا عذر کیا اور خیر خواہی کا آئندہ کے واسطے اقرار کیا اور بہت سی باتیں ظاہر و دہری کی بنا دیں جس سے صاحب بہت خوش ہوئے نواب صاحب رخصت ہو کر چلے آئے اور تین دن

سے معلوم ہوتا ہے مصنف کتاب سے باز پرس ہوئی ہوگی اسلئے ان کو یہ عذر لکھنا پڑا۔ حسن نظامی

کے بعد پھر حاجی محمد میر خان، آغا حسن جان صاحب اور محمد اسماعیل خان صاحب کو ہمراہ لے کر مع ہر پریشاد مختار کے کلکٹر صاحب سے ملاقات کرنے گئے اور بیان کیا کہ میں سرکار انگریزی کا قدیمی و طیفہ دار ہوں صرف ظاہری طور پر صوبہ دوآبہ کی سند لے کر اپنی جان بچائی ہے کہ بغیر اس صورت کے کوئی صورت ممکن نہ تھی لیکن سرکار کی خیر خواہی میں کوئی امر خلاف مرضی سرکار کے نہ ہوگا پکتان تھڑ صاحب اور سپٹ صاحب نے کہا کہ آپ کے بزرگوں نے خیر خواہی کی ہنابرا علی مرتبہ حاصل کیا اور صاحب جاگیر ہوئے اگر آپ بھی اسی طرح خیر خواہ سرکار انگریزی رہیں گے تو آپ کی بھی آپ کے بڑوں کی طرح پرویش کی جائے گی بصورت دیگر بکھر پشانی اور کچھ حاصل نہ ہوگا اس لیے کہ ہمارے چند انگریزوں کے مر جانے سے ہماری کل قوم مفقود نہیں ہو سکتی۔ آپ دیکھیں گے کہ چند روز کے بعد ہزاروں گورے اور سینکڑوں صاحب لوگ تمام ہندوستان میں نظر آئیں گے۔ نواب صاحب نے یہ سب باتیں تسلیم کیں اور حصت ہو کر مالاکڈہ میں پہنچے۔

.....

دوسرے دن نمبر دار موضع سائل پور جس کے بیٹے چاند خان کو کلکٹر صاحب نے بغیر ثبوت جرم پچانسی دے دی تھی سو سوار اور پچاس پیادوں کو ساتھ لے کر نواب صاحب کی خدمت میں آیا اور کلکٹر صاحب کی شکایت کی نواب صاحب نے کہا کہ تم خاطر جمع رکھو اچھی طرح سمجھا جائے گا۔

موہن لال صاحب نے ازراہ خیر خواہی ان تمام حالات سے بذریعہ جھپٹی انگریزی کلکٹر صاحب کو اطلاع دیدی یہ اطلاع ملنے پر کلکٹر صاحب نے ایک خط نواب ولی داد خان کو اس مضمون کا لکھا کہ سننے میں آیا ہے کہ موضع سائل پور کے زمیندار آپ کے اغوا سے دنگہ فساد کا ارادہ رکھتے ہیں اگر ایسا ہوا تو تم کو بچانی

دے دی جائے گی۔ اور علاقہ ضبط ہو جائے گا۔ نواب ولی داود خان نے اس کے جواب میں ایک خط عذرو لجاجت آمیز لکھا اور اس میں یہ بھی لکھا کہ میں فرمانبردار ہوں اگر حکم ہو تو حاضر ہوں اور آپ کی خدمت کروں اور قلعہ قلعہ جس کو آپ حکم دیں اس کے سپرد کروں اور خود دوسری جگہ چلا جاؤں اس کے جواب میں کلکٹر صاحب نے دوسرا خط صلیح و آشتی کا لکھا چونکہ دونوں طرف سے ظاہری دہکاوے کی باتیں تھیں اس لیے کوئی نتیجہ نہیں نکلا اور نواب ولی داود خان کا نتیجہ برا ہوا۔

مالا گڈھ پہنچنے کے بعد وہاں کی نظامت سے مغرور ہو کر چند روز تو جبراً تہراً اپنے قول و قرار پر قائم رہے اور جب مفسدوں کی فوج وغیرہ فراہم ہو گئی تو سرکشی پر کمر باندھی اور رہنمی اختیار کر کے سرکاری ڈاک روک لی اور سامان جنگ کی فراہمی میں مشغول ہو گئے اور ہم دونوں کو خیر خواہ سرکار انگریزی سمجھ کر اور مخبر و جاسوس جان کر ایک کو ٹھہری میں قید کر دیا۔ ذرا خیال مروت نہ کیا جتنا کلکٹر قلعہ داروں کی اسخرا فی سے ناراض ہو کر اور مصلحت وقت دیکھ کر میرٹھ چلے گئے اور اس حال کی رپورٹ لفٹننٹ گورنر کو دیدی ایک ہفتہ کے بعد جب صاحب کلکٹر کو معلوم ہوا کہ مفسدوں کی فوج پورب سے آئی ہے اور انھوں نے بلند شہر میں پڑاؤ کیا ہے تو سب اسباب وغیرہ چھوڑ کر ہاپڑ کی طرف چلے گئے جب ولی داود خان کو صاحب کلکٹر کے چلے جانے کی خبر معلوم ہوئی اور معلوم ہوا کہ بلند شہر حکام سے خالی ہو گیا ہے تو اسی وقت محمد اسماعیل خان کو پچاس سوار اور چالیس تیلنگے اور ایک توپ دے کر بلند شہر کے انتظام کے واسطے روانہ کیا۔ اسماعیل خان نے اسی وقت بلند شہر پہنچ کر وہاں کا انتظام اوشہرہ کا بندوبست کیا اور کلکٹر صاحب کا اسباب کو توالی میں مقفل کر دیا۔ علی الصبح کلکٹر صاحب یہ سن کر کہ باغیوں کی فوج مقام چولا سے جو بلند شہر سے چار گز

کے فاصلہ پر پہ گزرے گی بلند شہر میں داخل ہوئے اور اسماعیل خان کو طلب کیا اس وقت اسماعیل خان نواب صاحب کے کام میں لگے ہوئے تھے اور کلکٹر صاحب نے جو توہیں ملاکڈ سے منگو اکڑ کوٹھی میں دلوادی تھیں وہ نکلوا رہے تھے اور تقریباً چالیس تلنگے اور ایک توپ گراب سے بھری ہوئی کو توالی کے دروازہ پر لگی ہوئی تھی محمد اسماعیل خان اس طرف سے روانہ ہوئے اور کلکٹر صاحب دوسری طرف سے دونوں سے بازار میں ملاقات ہوئی۔ کلکٹر صاحب نے کو توالی کی طرف جانے کا ارادہ کیا اور اپنے ہمراہی سواروں سے کہا کہ اس جگہ ہم کو دغا معلوم ہوتی ہے کلکٹر صاحب کے خیال میں یہ بات آئی کہ توپ اور تلنگے ہم سے لڑنے کے واسطے کھڑے ہیں ہر چند اسماعیل خان نے اس بارہ میں بے حد انکار کیا لیکن کلکٹر صاحب نے کچھ نہ سنا اور ایک طنچہ کا فیر کیا ایک شخص کے پاؤں میں لگا اس وقت تلنگوں نے بھی توپ میں بتی لگائی اور کلکٹر صاحب تین گراب کھا کر معہ دوسو سواروں کے ہاپڑ کی طرف چلے گئے اور محمد اسماعیل خان ہربان علی خان کو بلند شہر کا کو توال بنا کر اردو ہاں کا انتظام کر کے نواب صاحب کی خدمت میں پہنچ گئے اور اس معرکہ کا سارا حال ان سے بیان کیا اسی دن سے تباہی اور فساد کی جز قائم ہوئی اور دونوں جانب سے خط و کتابت اور ظاہری اتفاق ہو تو ف ہو گیا اور دن بدن عداوت و رنجش بڑھتی گئی یہاں تک کہ لڑائی کی نوبت پہنچ گئی ۔

چونکہ گورنر جنرل کا حکم کمانڈر انچیف اور تمام صاحب لوگوں کے پاس پہنچ گیا تھا کہ فتح دہلی تک کسی سے جنگ نہ کی جائے اس لیے کلکٹر صاحب نے نواب صاحب کی سزا دہی کا خیال نہیں کیا اور گورنر جنرل کے حکم کی تعمیل میں میرٹھ کی طرف چلے گئے اور نواب صاحب سامان جنگ کی فراہمی اور سواروں کی دیکھ بھال

میں مشغول ہو گئے اور حکام انگریزی دہلی کی جنگ کی تیاریاں کرنے لگے۔ اسی زمانے میں تقریباً تین سو سپاہی لٹلنگر روٹے پیٹتے نواب ولید خان کے پاس پہنچے اور بیان کیا کہ ہم بہت کچھ سامان نقد و جنس لے کر مالگڈھ کی طرف آرہے ہیں کہ موضع کلی بٹونہ کے زمینداروں نے ڈاکر ڈال کر ہم سب کو گرفتار کر لیا اور سب سامان وغیرہ چھین کر موضع سے باہر نکال دیا۔

نواب صاحب نے محمد اسماعیل خان کو جو بہادر اور دلیر آدمی تھے پچاس سوار اور دو توپیں دے کر موضع کلی بٹونہ سے وہ تمام سامان جو وہاں کے زمینداروں نے تنگلوں سے چھین لیا تھا واپس لانے کے واسطے بھیجا۔ محمد اسماعیل خان موضع مذکور میں اپنے کیل کانٹے سے درست ہد کر پہنچے اور وہاں کے زمینداروں سے وہ سامان طلب کیا وہاں کے زمیندار اور نمبردار وغیرہ بہت عقل مند تھے انہوں نے چار دن تک اسماعیل خان کی خوب خاطر مدارات کی اور اندر ہی اندر خفیہ طریقہ سے زینیل صاحب کلکٹر سابق بلند شہر کو خبر بھیج دی۔ کلکٹر صاحب کو جو ہنی جڑی وہ فوراً اسی وقت دوسو سوار اور دو توپیں لے کر موضع مذکور کی طرف روانہ ہو گئے اور صبح کو جب قریب پہنچ گئے تو کسی شخص نے اسماعیل خان کو ان کے آنے کی خبر پہنچا دی۔ اسماعیل خان اسی وقت سوار ہو کر راستہ سے بچ کر مالگڈھ پہنچ گئے اور کلکٹر صاحب موضع گلاڈی جو موضع کلی بٹونہ کے قریب ہے اور نواب صاحب کے علاقہ میں ہے پہنچے اور پوچھا کہ اسماعیل خان کہاں ہے جو نائب صوبہ ہے صوبہ بھاگتا نہیں ہے یہ کس طرح کا نائب ہے کہ لڑائی کے خوف سے بھاگ گیا اس قسم کی باتیں کر کے میرٹھ واپس چلے گئے۔

چند روز اس طرح گزرنے کے بعد نواب صاحب نے پھر اسماعیل خان کو ڈیڑھ سو سوار اور دو سو بیادے اور تین توپیں اور میگنیزین وغیرہ دیکر روانہ کیا اور

اُمین گوجر کی ایک ہزار گوجروں کی جمعیت بھی ساتھ کی اور موضع کلی بٹونہ کی طرف روانہ کیا یہ لوگ موضع مذکور کے لوٹنے کے واسطے روانہ ہوئے موضع مذکور کے زمینداروں نے معرکہ سے دو تین روز قبل نواب صاحب کے پیچپیوں کو روپیہ کا لالچ دے کر بلکہ کچھ تھوڑا بہت پیشگی بھی دے کر اپنا طرفدار بنالیا تھا۔

موضع مذکور کے زمینداروں نے بہت کچھ منت سماجت اور عاجزی و کمسائی کی اور دو ہزار روپیہ نقد اور نذر بھینٹ قاعدہ کے موافق محمد اسماعیل خان کو پیش کی لیکن اسماعیل خان نے کچھ نہیں لیا اور کہا کہ جب تک دس ہزار روپیہ نقد اور کل مال و جنس تلنگوں اور مسافروں کا جو لٹا ہے نواب صاحب کی خدمت میں نہ پہنچا دو گے لڑائی سے ہاتھ نہیں اٹھاؤں گا۔ اسی تکرار میں ایک رات دن گزر گیا دوسرے روز دوپہر کے قریب دونوں طرف سے لڑائی ٹھن گئی۔ تو پیچپیوں نے توپیں مارنی شروع کر دیں کہ ایک دم تقریباً تین ہزار جاٹ تلواریں اور تھنگ ہاتھوں میں لیے ہوئے مقابلہ کے لیے نکلے پہلے مسی اُمین گوجر جس کا ذکر ادراچکا ہے معہ اپنی جماعت کے اسماعیل خان کو چھوڑ کر میدان سے بھاگ نکلا اس کے بعد محمد اسماعیل خان کے کل توپچی تینوں توپوں کو چھوڑ کر گاؤں میں بھاگ کر داخل ہو گئے یہ رنگ جب سواروں نے دیکھا کہ توپچی اور گوجر بھاگ گئے تو وہ بھی جاٹوں کی کثرت دیکھ کر میدان جنگ سے بھاگ کھڑے ہوئے اب صرف اسماعیل خان اپنی بہادری اور جرات سے تیرہ سواروں کے ساتھ میدان میں ڈٹے رہے آخر ایک گری محمد اسماعیل خان کے لگی اور وہ بھی زخمی ہو گئے۔ جب محمد اسماعیل خان زخمی ہو گئے تو ان کے ہمراہی سوار ان کو سمجھا بھا کر لڑائی کے میدان سے ہٹا لائے اور مال لگدھ کی طرف ان کو لے گئے۔ جب اس طرح لڑائی کا خاتمہ ہو گیا تو موضع کے زمیندار تینوں توپیں میدان جنگ سے اٹھا کر لے گئے۔

محمد اسماعیل خان زخمی ہو کر جب ملا گڈہ میں پہونچے تو نواب ولی داد خان نے مصلحت وقت سمجھ کر محمد اسماعیل خان کی بہت دلجوئی کی اور ان کی مرہم بچی کی لیکن محمد اسماعیل خان چونکہ ایک بہادر آدمی تھے وہ اپنی اس شکست سے نہایت غمگین اور ملول تھے اور کہتے تھے کہ جہاں تک ممکن ہو گا یا تو موضع کلی بٹونہ کو تباہ و برباد کر کے چھوڑ دوں گا یا اپنی جان دے دوں گا۔ اس ہر میت اور پسپائی سے جو کچھ عزت اور دہاک نواب صاحب اور محمد اسماعیل خان کی تھی بالکل جاتی رہی اس کے بعد سے نواب صاحب کے علاقہ میں بد عملی اور بے ترتیبی چاروں طرف پھیل گئی اور ان کی ہوا اکھڑ گئی۔ روپیہ بھی وصول ہونا بند ہو گیا اور آنے جانے والوں کا راستہ رک گیا۔ اس شکست کا نواب صاحب پر بھی یہ اثر ہوا کہ انھوں نے دو وقت تک کھانا نہیں کھایا بلکہ ایک روز تو شرم کے بلے گھروں سے نہیں مکھلے نہ کسی سے بات چیت کی جب یہ خبر حکام انگریزی کو پہونچی تو وہ بہت خوش ہوتے اور خوب ہنستے۔

اگرچہ نواب ولی داد خان کے پاس تقریباً سات ہزار سوار اور تین ہزار پیادے زنگوٹ تھے اس کے علاوہ ضرورت کے لائق ہر قسم کا سامان بھی موجود تھا اور وہ پیسہ پیسہ بھی انھوں نے بہت پیدا کر لیا تھا لیکن جسدن سے موضع کلی بٹونہ کے زمینداروں نے شکست دی تھی اس روز سے وہ باوجود اپنی اس جماعت کثیر کے مطمئن نہ تھے نہ ان کے چہرہ پر ہنسا شیشی تھی ۔

چند روز میں محمد اسماعیل خان کے زخم اچھے ہو گئے اور ان کا ارادہ تھا کہ کلی بٹونہ کے لوگوں کو اسکی مزادوں کو اتنے بین اچانک ایک دن صبح کو دھمکارے ملا گڈہ پہنچے اور انھوں نے ضروری کہ ترنیل صاحب نے دو سو گورے اور تین سو سواروں کی اور چار توپیں لے کر ہاپڑ کے میدان میں پڑاؤ کیا ہے اور ان کا ارادہ ملا گڈہ پر حملہ کرنے کا ہے یہ خبر

سُن کر محمد اسماعیل خان نے نواب صاحب سے کہا کہ مالاکندہ اور ہاڑکے درمیان صرف بارہ کوس کا فاصلہ ہے تعجب نہیں ہے کہ یہ خبر سچ ہو۔ چونکہ ترتیل صاحب بہت بہادر آدمی ہیں ایسا نہ ہو کہ وہ رات کو چھاپہ ماریں اس لیے مناسب ہے کہ میں اسی وقت فوج لے کر راستہ ردک دوں نواب صاحب نے بھی اس کو مناسب جانا چنانچہ اسی دن قریب شام کے محمد اسماعیل خان اور حاجی محمد منیر خان ساڑھے تین سو سوار اور دو سو پیادے ساتھ لے کر موضع گلاؤٹی کی طرف جہاڑ اور مالاکندہ کے درمیان پہرہ روانہ ہو گئے۔ گلاؤٹی کے لوگ انگریزی لشکر کے خوف سے گلاؤں چھوڑ کر ایک نالے کے پل پر جو گلاؤٹی اور ہاڑکے سڑک پر ہے پڑے ہوئے تھے اور وہیں رات بسر کی تھی۔ ہندوستانی فوج کے سپاہی جیسی آمادگی اور ہوشیاری دکھلاتے تھے ویسی ہوشیاری و آمادگی ان میں نہ تھی اس لیے اسماعیل خان کے ہمراہی جو رنگروٹ تھے اور کبھی ان کو لڑائی بھڑائی کا تجربہ نہیں ہوا تھا کچھ تو زین بچھا کر سو گئے کچھ پیاسے بیٹھے ہوئے تھے کچھ شراب پی رہے تھے کہ یکایک صبح کا زب کے وقت ترتیل صاحب اپنی فوج لے کر ہوئے نواب صاحب کی فوج پر بجلی کی طرح آن پڑے اندھیرے کی وجہ سے کچھ تہ نہ چلا۔ دوست دشمن کی تمیز نہ تھی اس معرکہ میں تقریباً چالیس پیادے نواب صاحب کے گھوڑوں کی ٹانگوں سے کچل گئے اور کچھ سوار مارے گئے اور چند زخمی ہوئے اور اسماعیل خان بھی زخمی ہو کر بھاگ کھڑے ہوئے اسماعیل خان کی تمام فوج پر لگندہ اور منتشر ہو کر اس طرح بھاگی کہ کچھ تو خان پور کی طرف منہ اٹھا کر چلے آئے کچھ خوجہ اور بلند شہر کی طرف نکل گئے۔ کچھ قصبہ بگرا سہی چلے گئے۔ الغرض جس کا بدھر منہ اٹھا چلے یا تین سو پچاس سواروں میں سے ستر سوار مالاکندہ میں پہنچے باقی ادھر ادھر چھپ گئے۔

ترتیل صاحب نے توہیں مارتے ہوئے بھاگنے والوں کا گلاؤٹی تک پیچھا

کیا اور گلاؤٹی پہونچ کر وہاں کے تحصیلدار اور نمبردار کو گرفتار کر لیا اور جتنا روپیہ باقی کا چاہیے تھا سب وصول کر لیا دو گھنٹہ وہاں قیام کر کے پھر ہاپڑ کی طرف واپس ہو گئے ۔

نواب دلی داد خان کے پاس جب بھگوڑے سپاہی پہونچے تو وہ بہت لال پیلے ہوئے اور سپاہیوں پر بڑی لعنت ملاست کی تین دن میں تمام بھاگے ہوئے لوگ پھر مالا گڈھ میں جمع ہو گئے نواب صاحب بہت غلگین اور خبیث تھے کہ اسی دن امیر علی خان دامراؤ بہادر پسران نواب مظفر علی خان رئیس کھلیا چھ سو سوار اور چار سو پیادے لیے ہوئے نواب صاحب کی مدد کے لیے مالا گڈھ آئے ان لوگوں کے آنے سے نواب صاحب کو بہت تقویت ہو گئی ۔

دو مہینہ کے بعد آخر جولائی ۱۸۵۷ء میں منشی موہن لال آغا حسن جان ادریس بہت کوشش اور جان جو کھوں سے سپاہیوں اور پہرے والوں کو غافل پاکر نکل بھاگے اور گرتے پڑتے خان پور میں نواب محمد مصطفیٰ خان اور نواب غلام علی خان کے پاس پہونچے اور خدا کا شکر ادا کیا زیادہ تر مشرک کا باعث یہ ہے کہ ہم لوگوں کے بھاگنے کے تیسرے روز ایک شخص زین العابدین میاں زرگی شاعر کا چھوٹا بھائی مع پچاس سواروں کے نواب ولید داد خان کے ساتھ حق دوستی ادا کرنے اور اپنی دینداری جتانے کیلئے صرف میرے اور موہن لال کے قتل کرنے کے واسطے مراوا آباد سے مالا گڈھ آیا اور اس قدر قتل پر آمادہ و تیار تھا کہ کہتا تھا جب تک ان دونوں کو قتل نہیں کر لوں گا کمر نہیں کھولوں گا۔ لیکن جب باوجود بے حد تلاش و جستجو کہ ہم لوگ اس کے ہاتھ نہ آئے تو تھک کر بیٹھ رہا۔

رسیدہ ہو دیائے و لے بخیر گزشت

میں مالاکدہ کی نمک حرامی اور انگریزوں کے ساتھ بناوٹ اور مقابلہ شکست کی خبریں بذریعہ اخبار و انگریزی گزٹ تمام لوگوں کو معلوم ہو گئی ہیں اور محتاج بیان نہیں ہیں اس لیے میں نے بوجہ طوالت بیان اور کسر شان سرکار انگریزی ان کا اعادہ نہیں کیا کیونکہ ایک زمیندار کے ساتھ لڑائی جھگڑے کا ذکر نازیبا ہے ہاں مقابلہ جنگ فرنگ کے ذکر سلطان روم اور شاہ روس و فرانس کا کیا جاوے تو مناسب ہے۔

قصہ مختصر اب میں کچھ ذکر دہلی کی پہلی چیل پہل اور موجودہ بے رونقی کا کرتا ہوں ۔

خدا تملگوں کو برباد کرے ان کے قدموں کی نحوست سے دہلی ایسی برباد ہوئی کہ ہر طرف ہو کا عالم نظر آتا تھا یا زار خاک کوڑے سے اٹے پڑے تھے مکانوں کی حالت پائخانوں سے بدتر ہو رہی تھی شہر کوں پر پیشاب پاخانوں کی ہنریں جاری تھیں برخلاف اس کے انگریزی عمارتوں میں جو رونق دہلی کی تھی اسکو دیکھنے والے ہی رہتا سکتے ہیں ۔

اب وہ وقت آگیا کہ آسمان کینہ پرور میموں اور مصوم بچوں کے خون کا بلہ لینے کے لیے تیار ہو گیا اور انگریز آمادہ جنگ ہو گئے ۔

پہلا معرکہ

اچانک یکم جون ۱۸۵۷ء کو صبح کے وقت تملگوں کے لشکر میں خبر پہنچی کہ گوروں کی

فوج غازی آباد کے میدان میں جمع ہوئی ہے یہ سن کر ادھر سے مرزا خضر سلطان مرزا عبداللہ میر نواب اور نواب محمد محسن خان تین پلٹن چھ سو سوار اور چھ توپیں اور بہت سا میگنیزین وغیرہ لے کر مقابلہ کے لئے روانہ ہو گئے ان لوگوں نے ہینڈلن ندی کے پُل کے قریب مقام کیا یہ لوگ ابھی اپنے مورچے بھی قائم نہ کرنے پائے تھے کہ انگریزی فوج نے تباہ توڑ گولے اور گولیاں برسائی شروع کر دیں سنگوں کی فوج ابھی سنبھلنے بھی نہ پائی تھی۔ لیکن مستعد ہو کر مقابلہ میں ڈٹ گئی پھر تو دونوں طرف سے گولوں اور گولیوں کا وہ مینہ برسا کہ الہی تو بہ تمام میدان دھواں دھار ہو گیا اتفاق وقت کہ انگریزی سپاہیوں نے کچھ ایسی تیزی سے گولے برسائے کہ بلنگوں کے پاؤں اکھڑ گئے آخر فوج یہاں تک پہنچی کہ بلنگے تین توپیں اور کئی سو بند قس اور بہت سا سامان جنگ میدان میں چھوڑ کر بھاگ نکلے اور قلعہ کے دروازہ سے شہر دہلی میں داخل ہو گئے گوروں نے ان لوگوں کا پیچھا نہیں کیا بلکہ غازی نگر ہی میں قیام کر کے جن لوگوں پر بدخواہی سرکار انگریزی کا گمان تھا ان کو سزائیں دیں اور مقتولین کو دفن کیا اور زخمیوں کو ساتھ لے کر بوجہ حکم کمانڈر اپنیخیف دوسرے لشکر کے ساتھ شامل ہونے کے واسطے علی پور کی طرف دوسرے دن روانہ ہو گئے۔

باغیوں کی فوج نے ابھی کمربند بھی نہ کھولی تھیں کہ انگریزی لشکر نے علی پور پہنچ کر کامیابی کا جھنڈا اکاڑ دیا۔ جب یہ خبر باغیوں کو پہنچی تو یہ لوگ ہیڑائی کے لئے تیار ہو گئے اور میر نواب پسر میر فضل حسین وکیل و میر فتح علی مرزا علی سپہ سالار کے حکم سے بہت سی فوج اور توپیں اور سامان جنگ لے کر علی پور روانہ ہو گئے چار گھنٹی دن باقی تھا کہ یہ لوگ علی پور کے قریب پہنچ گئے اور سرائے بادی پر ڈیرے ڈال دیئے دن نکلنے سے پہلے ہی انگریزوں نے ایک عجیب چال چلی یعنی پانچسو

گوروں نے لباس بدل کر عمامہ وغیرہ باندھ کر بالکل مسلمانوں کی شکل بنالی اور اپنے دوسواروں کے ہاتھ باغیوں کی فوج میں کہلا بھیجا کہ ہم مسلمان ہیں اور چوتھے رسالہ کے ہیں بادشاہی فوج میں شامل ہونے کے واسطے آئے ہیں ان لوگوں کو یقین آگیا اور اجازت دے دی کہ آئیے اور دینی لڑائی میں شرکت کیجئے۔ گورے مخالفین کے لشکر کے قریب ہی جواب کے منتظر کھڑے تھے اجازت ملنے ہی باغیوں کی فوج میں چلے آئے اور زور سے کہا سلام علیکم۔ اور سامنے آتے ہی ان غافل لوگوں پر بند و قوں کی ایک باڑ چلائی نظام ہرے کہ بخبری کے عالم میں ان پر حملہ کا کیا اثر ہوا ہو گا پانسو بند و قوں کی ایک دم باڑے تلنگوں کے حواس کھو دیئے آخر اس اچانک حملہ سے گھبرا کر گیارہ توپیں اور سیکڑین وغیرہ چھوڑ کر بھاگے گوروں نے تعاقب کیا اور باڑہ مارتے ہوئے اجمیری دروازہ کی فصیل تک پہنچ گئے۔

جب بادشاہ کو یہ حال معلوم ہوا تو انھوں نے فرمایا کہ پہلی بسم اللہ ہی غلط ہوئی اب دیکھئے آئندہ کیا ہوتا ہے گوروں کی فوج اجمیری دروازہ سے واپس گئی اور پہاڑی کے مورچہ اور باؤٹہ کے مورچے جن پر تلنگوں کا قبضہ تھا حسن تدبیر سے لڑ بھڑ کر چھپیں لیئے اگر انگریزوں کو منظور ہوتا تو اسی دن دہلی فتح ہو جاتی۔ لیکن انگریزوں نے احتیاطاً شہر میں قدم نہیں رکھا اور پہاڑی اور باؤٹہ کی ان توپوں کا منہ تلنگوں سے چھل کی تھیں قلمہ کی طرف کر دیا اور ایسے قرینہ سے توپیں لگائیں کہ باغیوں کو ایک قدم آگے بڑھنے اور ایک منٹ وہاں ٹہرنے کی تاب نہ رہی۔

ایک دن چھاؤنی نصیر آباد کی فوج ہمت کر کے پہاڑی مورچے پر پہنچ گئی اور اس مورچہ کی توپیں چھپیں لیں اور کچھ گوروں کو قتل کر دیا کچھ گورے توپیں چھوڑ کر بھاگ گئے انگریزی افسروں نے یہ چالاک کی کہ اس جگہ بہت سے روپے اور چاندی وغیرہ کے

برتن بھیر دیئے یہ لالچی ان چیزوں پر ایسے ٹوٹ کر گرے جس طرح بھوکا کبوتر دانے پر
گرتا ہے گورے گھات میں لگے ہوئے۔ تہ جب انھوں نے ان کو غافل پایا فوراً بندوبست
کی باڑ مار دی۔ سینکڑوں تو وہیں ڈھیر ہو گئے اور جو بچے وہ زخمی ہو کر بھاگ گئے۔ روزانہ
یہی ہوتا تھا کہ کئی کئی ٹولیاں تلنگوں کی ہمت کر کے آتی تھیں اور سپاہی جان پر کھیل کر
پہاڑی کی بلندی تک پہنچ کر توپیں چھین لیتے تھے لیکن آس پاس سے جو توپوں کی
مار پڑتی تھی تو گھبرا کر پہاڑی سے اتر آتے تھے۔

ایک دن انگریزی فوج نے بڑی بہادری کی تینوں ملٹین چھانڈی میرٹھ اور
وزیر آباد کی کوٹھیوں کا سامان وغیرہ لوٹ کر خوب مالدار ہو گئی تھیں اور ملٹن والے ہر
موقعہ پر لڑائی سے بچتے رہتے تھے۔ ایک رات ان میں سے پانسو جان اور سپاہیوں
کے طعن تشنیع سے شرمناک قدسہ باغ کے مورچے پر گئے وہاں جا کر کوئی تو ان میں سے
بھنگ پینے میں مشغول ہو گیا کوئی تو شہ دان کا تکیہ بنا کر سو گیا۔ الغرض سب کے سب
غافل پڑے ہوئے تھے کہ انگریزی لشکر اچانک ان غافلوں کے سروں پر
پھونچ گیا اور سینکڑوں کو زنج کر ڈالا بہت سے سپاہیوں کے ناک کان
کاٹ ڈالے جو اتفاق سے بچ گئے وہ بھاگ کر اپنے ٹھکانے پر پہنچ گئے۔
انگریزی لشکر کے سپاہی چھاپہ مار کر تلنگوں کی تین توپیں لے کر اپنے
مورچے کو واپس ہو گئے۔ الغرض ایک مہینہ تک اسی طرح کی لڑائیاں ہوتی
رہیں کہ اتنے میں مسیحی سخت خدان محمد شفیع تلنگوں کی چار ملٹین اور ایک ہزار پانچ
سو جہاز کرنے والے قریب قریب بارہ ہزار کی جمیعت لے کر مہ توپ خانہ اور
سیگزمین وغیرہ جولانی کے مہینہ میں دہلی پہنچے۔ دہلی دروازہ کے باہر قیام کیا
اور بادشاہ کے دربار میں حاضر ہوئے۔ بادشاہ کی طرف سے ان کو خلعت

عطا ہوا اور عہدہ جرنیلی پر سرفراز کیے گئے۔ اس عرصہ میں بے شمار فوجیں چھاپنی
پینچ نصیر آباد حصار لکھنؤ نوادیکسوی سے آکر دہلی میں جمع ہوئیں بادشاہ کو
ان کے آنے سے مسرت ہوئی اور رعایا بھی مطمئن ہو گئی۔

جب مدت ختم ہو گئی تو دونوں طرف سے گولہ باری شروع ہوئی سپاہی
بے چارے ہر مقام پر پہاڑی کا ثبوت دیتے تھے لیکن اپنی جانیں کھو کر
آخر پیا ہوتے تھے اور سامان جنگ بھی چھوڑ آتے تھے۔ فتح شکست تو وہی
بات سے ظاہر ہوتی تھی کہ انگریزوں کا جھنڈا تو پہاڑی پراڑ رہا تھا اور باغیوں
کا جھنڈا امداد صاحب روہ کے نیزے کی طرح گلی کوچوں میں مارا مارا پھرتا تھا
اور پہاڑی کے پیچے خون کی ایک نہر جاری تھی جس میں سینکڑوں لاشیں پھیلیں
کی طرح تیرتی تھیں۔ الغرض روزانہ لڑائی کا یہی ڈھنگ جاری تھا کہ نواب
مظہر علی خان رئیس کھلیا کے چھوٹے بیٹے امراؤ بہاؤ عرف کامونہ ایک ہزار سوا
اور پیا دے لے کر اگست کے مہینہ میں بادشاہ اور باغیوں کی مدد کے لیے
دہلی پہنچے اور چند روز قیام کر کے اور سامان جنگ درست کر کے جوانی کی
ترنگ میں پہاڑی کا مورچہ چھیننے کے لیے انگریزی فوج کے مقابلہ میں گئے
مگر ان کے ہندوق کی ایک گولی لگی اور چند روز میں اس صدمہ سے انتقال
کر گئے۔ ان کے انتقال سے بادشاہ کو ان کی جوانی اور جوانمردی کی بنا پر بہت
سج ہوا۔ مرشد زادوں کا حال کیا بیان کیا جاتے احمد مرزا مرزا فاضل بیگ
میر نواب میکم عبدالحق قاضی فیض اللہ کو توال شہر اور عبدالحکیم ان کی بیات میں
تھے اور شہر کے چھٹے ہوتے بدعاش اور بدوضع لوگ ہر وقت مصاحبت میں
رہتے تھے۔ جو ہر وقت ساہوکاروں شہر کے امیروں سے روپیہ اینٹھنے کی
ترغیب دیتے رہتے تھے تمام شاہزادے اس لالچ میں مبتلا تھے فاکر مرزا اور

مرزا خضر سلطان چونکہ یہ دونوں بہت تجربہ کار اور سب میں سربر آوردہ تھے اور فوجی تقویت ہی حاصل تھی انھوں نے بہت ظلم پر مکر باندھی اور ان کے مصالح نے خوب رشوتیں یعنی شروع کیں ساہوکاروں اور شہر کے رئیسوں کو بلا بلا کر ان سے روپیہ لیتے تھے اور اپنے حظ نفس کے لیے خوب خرچ کرتے تھے۔ قلعہ اور شہر کے اکثر مکان انگریزی توپوں کے گولوں سے ٹوٹ پھوٹ گئے تھے خاصکر کشمیری دروازہ کا تو یہ حال ہو گیا تھا کہ وہاں کے تمام مکانات پھلنی ہو گئے تھے وہاں کے سوداگر اور رہنے والے دوکانیں اور کوٹھیاں چھوڑ چھوڑ کر دہلی دروازہ آگئے تھے کہ اسی درسیان میں خان پور لکھنؤ فرخ آباد بریلی رام پور وغیرہ سے بادشاہ کی خدمت میں تھے اور نذریں معہ عرضیوں کے سفیر نے پیش کیں بادشاہ نے سب کو قبول کر لیا اور ان کی عرضیوں کے جواب اور سفیروں کو خصوصی خلعت عطا کئے اور وکیل اپنے اپنے ٹھکانوں کو واپس آئے یہاں دہلی میں دونوں طرف سے رات دن لڑائی جاری تھی کہ ایک دن نصیر آباد کے باغیوں کی فوج بخف گدہ میں معہ توپوں اور میگنن کے مورچے بنا کر گھات میں بیٹھی ہوئی تھی کہ اتفاقاً بارش ہو گئی اور ان لوگوں کی محنت سب بر باد گئی اسپر مصیبت یہ نازل ہوئی کہ گوروں کی فوج آفت ناگہانی کی طرح ان پر ٹوٹ پڑی اور گولے مارنے شروع کر دیئے توڑی دیر دونوں طرف سے خوب لڑائی ہوئی۔ آخر کار نصیر آباد کی فوج پسپا ہوئی اور گیارہ توپیں چھوڑ کر بھاگ کھڑی ہوئی اس روزانہ کی شکست اور پسپائی سے افسروں کی ہمتیں ٹوٹ گئیں روزانہ یہی ہوتا تھا کہ باغیوں کی فوجیں ہمت کر کے میدان میں جاتی تھیں اور جب گورے پہاڑی سے پیچھے اتر کر حملہ کرتے تھے اور ہاتھوں میں چھوٹی چھوٹی توپیں لے کر گراب برساتے تھے تو سب بھاگ کھڑے ہوتے تھے اور گورے مارتے ہوئے

سب کو شہر میں داخل کر کے اپنے مورچوں پر واپس چلے جاتے تھے۔

ایک دن ایک منجھرنے خبر دی کہ گورے اور خاکی سپاہی مجدد علی خان کے باغ میں مہم چہ بنا رہے ہیں یہ خبر سننے ہی تلنگوں کے افسروں نے اسی دن تین بلٹنیں اور ایک ہزار سواروں کو چند توپیں دے کر مقابلہ کے لیے بھیجا جب یہ لوگ وہاں پہنچے اور دونوں طرف سے گولہ باری شروع ہوئی تو انگریزوں میں سے ایک انگریز نے ایک عجیب ہمدردی کا کام کیا کہ جس کو سنکر حیرت ہوتی ہے یعنی ایک انگریز گھوڑے پر سوار ہو کر بڑی تیزی سے تلنگوں کی فوج میں گھس آیا اور بڑی پھرتی سے گھوڑے پر سے اتر کر ایک توپ کے اوپر سوار ہو کر توپ کے پیالہ میں ایک لڑہے کی میخ ٹون دی اور ایک شخص کی تلوار سے وہیں ہلاک ہو گیا۔ اس کے بعد تلنگا انگریزی فوج سے لڑنے کے لیے باغ میں پہنچے اور حملہ کر دیا اچانک دو سو گورے دستی توپیں لیے ہوئے پہاڑی سے اتر پڑے اور گرا ب برسٹلے شروع کر دیئے۔ آخر تلنگے باوجود اس قدر جمعیت اور اتنے سامان کے وہاں سے بھاگ کھڑے ہوئے اور پہاڑ گنچ میں پہنچ کر وہاں کے مکانات توڑ پھوڑ ڈالے اور ان کے تختے اور کڑیاں نکال کر شہر میں آگئے۔

۱۰ اگست کو ایک عجیب سانحہ پیش آیا۔ چوڑی والوں کے محلہ میں بڑی بیگم کے ایک مکان پر شہر و صاحب باغیوں کے واسطے روزانہ ۲۵ من بارود تیار کرتے تھے اتفاقاً کسی شخص نے اس کارخانہ میں ایک چنگاری آگ کی ڈال دی بارود بھٹک سے اڑی اور تقریباً چھ سو کارہ گہر مرد عورت اس صدمہ سے جھک خاک ہو گئے تلنگوں کو تہ گمانی ہوئی کہ یہ کام حکیم حسن اللہ خان کے اشارے سے ہوا ہے۔

یہ خیال کر کے تلنگوں نے حکیم صاحب کو قید کر لیا اور ان کا تمام مال و اسباب شیشہ آلات اور تصویریں اور قطعہ جو دیواروں پر لٹکے ہتے اور ہزار ہا کی مالیت کے ہتے توڑ پھوڑ ڈالے اور مکان کی چھت میں آگ لگا دی اور ان کا اسباب وغیرہ چھکڑوں پر لاد کر لے گئے اور حکیم صاحب کے قتل پر آمادہ ہو گئے لیکن بادشاہ نے بڑی منت سماجت سے حکیم صاحب کی جان بخشی کر لی اور مرزا منٹل کو ساتھ کر کے ان کے گھر پر پہنچا دیا ۔

چند دن کے بعد تلنگے ایک شخص کو گرفتار کر کے بادشاہ کے سامنے کھینچے ہوئے لائے یہ آدمی لائبے قد کا خوبصورت تھا اور جو گیا لباس پہنے ہوئے تھا۔ تلنگے اس کو لارنس صاحب بہادر سمجھ کر گرفتار کر لائے ہتے بادشاہ سے کہا کہ یہ لارنس ہے اور اس کا ثبوت یہ ہے کہ کابل کی لڑائی میں یہ زخمی ہوا تھا چنانچہ اس کے شانہ پر گولی کا نشان موجود ہے اس کو زندہ کر کے گولی کا نشان دکھلایا بادشاہ نے حکم دیا کہ اس کو میرے سامنے سے لے جاؤ اور جو مناسبت سمجھو وہ کر دو ان کم بختوں نے اسی وقت میدان میں لے جا کر اس بے گناہ فقیر کو گولی سے مار ڈالا۔ اسی دن ان تلنگوں نے ایک اور سوانگ بنایا کسی انگریز کا سر نیزہ پر رکھ کر تمام گلی کوچوں میں پھرایا اور کہا کہ یہ سر جان متکلف صاحب کا ہے بلکہ بادشاہ کے پاس بھی لے گئے اور بادشاہ کے سامنے بڑی شیخیاں بگھمائیں کہ بڑی جان فروشی کا کام کیا ہے بادشاہ نے اس کے صلہ میں سچا پاس روپے انعام دیئے پھر کیا تھا پھر تو یہ لوگ روزانہ ایک نہ ایک شعبہ ایسا ہی کیا کرتے ہتے اور اس طرح بادشاہ سے انعام وصول کرتے تھے ۔

القصد چار مہینے تک مسلسل اسی طرح لڑائی جاری رہی دونوں طرف امید و
 بیم کی حالت تھی باغیوں کی فوج شہر دہلی میں محصور تھی اور گوروں کی فوج
 پہاڑی کے مورچے پر۔ انگریزوں نے قصد اُدہلی کا فتح کرنا نہیں چاہا کیونکہ دہلی
 فوجوں اور قلعہ شکن توپوں کے آنے کے منتظر تھے بالآخر ستمبر کے مہینے میں بڑی
 توپیں پھیلور کے قلعہ سے پہاڑی پر آگئیں۔ اس کے بعد انگریزوں نے قدسیہ
 باغ میں مورچے قائم کرنے شروع کر دیئے۔ جب انگریز مورچے وغیرہ قائم کر کے
 خوب کیل کانٹے سے درست ہو گئے تو انھوں نے اس کثرت سے قلعہ کے
 شاہی مکانوں اور شہر پناہ کی دیوار پر گولے برسائے کہ قلعہ اور شہر کے رہنے والے
 تنگ آ گئے تمام لوگ شہر چھوڑ چھوڑ کر بھاگ گئے صد ہا مکان سمار ہو گئے شہر پناہ
 کی فصیل بھی ٹوٹ گئی اور بادشاہی خواجگاہ کو بھی صدمہ پہونچا چھ رات دن برابر
 توپوں سے آگ برسی رہی تمام عالم تہ و بالا ہو گیا۔

آخر وہ دن آہی گیا کہ ولی کا ٹٹما نا ہوا چراغ گل ہو جائے اور چنگیزی
 نسل کا آخری اور برائے نام بادشاہ عالم ضعیفی میں مصیبتیں جھیلے۔

ستمبر کی چودہ تاریخ کو جمع ہونے سے پہلے گوروں کی تین پٹنیں اور گور کھا
 پٹن اور چند سواروں کے سارے سپہ سپاہیاں لگا کر جس طرف سے فصیل ٹوٹ گئی تھی
 پر چڑھ گئے اگرچہ ان میں سے بہت سے مارے گئے لیکن انگریزوں کا ستار اقبال
 اوج پر تھا باغی بھری ہوئی توپیں اور میگنیزین وغیرہ جہاں تھا چھوڑ چھوڑ کر
 بھاگے اور انگریزی فوج شاہ برج اور کشمیری دروازے سے فاتحانہ طور پر داخل
 ہوئی۔ مورچوں میں جو کچھ سامان جنگ ملا سپہ قبضہ کر لیا یہ جب کشمیری دروازہ
 کا بلی دروازہ اور اجمیری دروازہ اور میگنیزین وغیرہ سب پر انگریزوں کا قبضہ ہو گیا

تو انھوں نے پن چکی پر اور نواب حامد علی خان کی کوٹھی کے پاس توپیں لگا دیں جس کی وجہ سے باغیوں کے سب راستے بھٹکنے کے بند ہو گئے۔ چند گورے جو بے وقوفی سے شہر میں چلے گئے تھے وہ مارے گئے جب بادشاہ کو انگریزوں کے شہر میں داخل ہونے کی خبر پہنچی تو انھوں نے فرمایا کہ میں نے تو پہلے ہی کہہ دیا تھا کہ نتیجہ یہی ہونا ہے آخر ان نمک حراموں نے سلطنت کو تباہ کیا اور تمیز کا نام دنیا سے میٹ دیا اور میرا بڑھا پا خراب کیا خیر اب آج میں خود مقابلہ کروں گا۔

سب کو خبر کر دو کہ ہماری سواری کے وقت حاضر ہوں اور مدد کریں۔ چنانچہ بادشاہ خود سوار ہو کر لال ڈوگی پر تشریف لائے اور تمام فوج اور رعایا جمع ہوئی لیکن انگریزوں کی گولیاں لال ڈوگی تک پہنچتی تھیں اس لیے افسران نے عرض کیا کہ حضور کا یہاں ٹھہرنا مناسب نہیں ہے ایسا نہ ہو کہ حضور کو کچھ صدمہ پہونچے بادشاہ ان لوگوں کے کہنے سے قلعہ میں چلے آئے اور شہزادوں نے جو فوج کے افسر تھے فوج سے ہر چند کہا کہ ہمت کرو اور مرد بنو لیکن نمک حرام تلنگوں نے بہوک اور رسد نہ ملنے کا بہانہ کر کے جو کچھ دکانیں وغیرہ باقی رہ گئی تھیں لوٹ کھسوٹ کر بھاگنا شروع کیا۔ سب سے پہلے تلنگوں کی تین پلٹیں جو سلیم گڑھ اور جھروکہ قلعہ میں تھیں بھاگیں۔ پھر کیا تھا پھر تو ان کی دیکھا دیکھی بھاگڑ پڑ گئی اور جتنی باقی فوج تھی سب بھاگ گئی القصد چھ روز میں تمام فوجیں فرار ہو گئیں ۱۹ ستمبر ہفتہ کے روز بادشاہ نے مایوس ہو کر تمام بیگیاں اور مرشد زادوں کو رات کے وقت قلعہ سے باہر بھیج دیا اور خود بھی سوار ہو کر درگاہ حضرت نظام الدین اولیاء میں پہونچے اور پھر ہمالیوں کے مقبرے میں مقیم ہوئے قلعہ اور شہر کے تمام لوگ ننگے سر ننگے پاؤں شہر سے باہر نکلے اور جس کا جد ہر منہ اٹھا چل دیا کوئی قدم شریف کی طرف بھاگا کوئی پہاڑ گنج چل دیا کوئی جی سنگہ پورہ اکثر درگاہ سلطان جی صاحب اور روشن چراغ دہلی دو گاہ

حضرت خواجہ قطب الدین رحویؒ پالم بلب گڑھ فرید آباد وچھ فرخ نگر اور الور وغیرہ کی طرف چلے گئے جب انگریزوں کو معلوم ہوا کہ شہر اور قلعہ بادشاہ اور رعایا سے خالی ہو گیا تو انفسر معہ گوروں کی پلٹنوں اور گوروں کے ہندوستانی سپاہیوں کے قلعہ میں داخل ہوئے اور شہر کو گھیر لیا۔

سب سے پہلے انگریزوں نے شہر کے تمام دروازوں کا بندوبست کیا پھر بغاوت کے جرم میں رعایا اور شرفاؤں کو شہر بدر کر دیا اور جس شخص نے مقابلہ کیا وہ مارا گیا اور تمام مال و اسباب و مکان وغیرہ ضبط کر لیا گیا۔ اور بلا امتیاز ہندو مسلمان مجرموں کے تمام مکانات کھوڑوانے کا حکم ہوا۔ امیروں اور غریبوں کی عورتیں روتی پیتی پریشان حال قصبوں اور گاؤں کی طرف اور درگاہوں کی طرف جو شہر سے متصل تھیں نکل گئیں اور جہاں جس کو ذرا سا ٹھکانا پائیں ٹھکنے کا ہی ملا ہیں شہر گیا لیکن ان خستہ حالوں کو گوروں اور خاکیوں نے کسی جگہ بھی چین سے بیٹھنے نہ دیا جس کا موقعہ لگتا تھا لوٹ کر چلتا ہوتا تھا یہاں تک کہ لوگ نان شبینہ کو محتاج ہو گئے اور سینکڑوں فاقوں سے ہلاک ہو گئے سینکڑوں بیماریوں کے نذر بھینٹ چڑھ گئے عام لوگوں کے علاوہ تمام شہزادے اور شہزادیاں بھی اسی مصیبت میں مبتلا تھے۔ اور ان کی حالت سب سے زیادہ دردناک تھی۔

جب قلعہ اور شہر کا بندوبست ہو گیا تو ایک روز دو انگریز جن میں سے ایک کا نام ہڈن تھا چند سواروں کو لے کر مقبرہ ہمایوں میں گئے اور بادشاہ کو ایک پانچویں میں اور مرزا غفل مرزا خضر سلطان و مرزا ابوبکر کو رتھ میں سوار کر کے قلعہ میں لے آئے بادشاہ کو ناظر حسین مرزا کے مکان میں قید کر دیا اور تینوں شاہزادوں کو کوڑا لگی کے

سامنے کھڑا کر کے گولی سے اڑا دیا۔ اور نواب زینت محل اور مرزا جواں بخت کو بادشاہ کے قریب ایک علیحدہ مکان میں قید کر دیا اور حکیم احسن اللہ خان کو حالاً اہل قلعہ دریافت کرنے کے لئے نیز مجرموں اور فسادوں کی شناخت کرنے کے لئے ایک دوسرے مکان میں نظر بند کر دیا گیا۔

سینکڑوں مزدور قلعہ اور شہر کے مکانات کھودنے کے لئے مقرر کئے گئے مزدور رات دن مکانات کھود کھود کر وہ پیسہ نکال کر سرکار میں داخل کرتے تھے۔ جاگیرداروں اور راجوں کے نام پر دوائے لکھے گئے کہ مفسدوں اور مجرموں کو گرفتار کریں اور پروانوں کے ساتھ چند مخبر بھی شناخت کے واسطے بھیجے گئے۔

سائڈرس صاحب کاشمر مقرر ہوئے اور لباس صاحب شش نج اور ایچ بیٹن صاحب دہلی کے کلکٹر مقرر ہوئے اور جان مشکف صاحب مفسدوں کی گرفتاری کے کاشمر مقرر ہوئے ان چاروں صاحبوں نے بہت خوبی سے انتظام کیا۔ اور ایک تو برسہ لاکھ کو ایک سال سے بعد جرات کے دن انگریزوں نے بادشاہ کو بال بچوں سمیت کلکتہ پہنچا دیا۔

دہلی فتح ہونے کے چند دن بعد مالا گڈھ کے رئیس اور دیگر تعلقہ داروں کی سرکوبی کے لئے فوج روانہ ہوئی جب فوج وہاں پہنچی تو مالا گڈھ کے رئیس نے تھوڑی دیر انگریزی فوج سے مقابلہ کیا آخر مدد رئیس کہلیا کے بھاگ کر ۲۷ ستمبر کو بریلی پہنچے۔

انگریزی فوج نے مالا گڈھ کے علاقہ کو ضبط کر کے مالا گڈھ کے قلعہ کو کھود کر زمین سے برابر کر دیا۔ اور بلند شہر کے کلکٹر صاحب نے باغیوں کو بلند شہر خان پور اور غوجہ سے گرفتار کر کے کسی کو پچاسی دی

کسی کو حبس دوام کی سزا دی باقی لوگوں کو میرٹھ بھیج دیا اور کچہری وغیرہ کا کام پھر بدستور جاری ہو گیا اسی طرح دہلی کے حکام نے مجرموں کو گرفتار اور جاگیرداروں وغیرہ کو طلب کر کے قید کر دیا اور سینکڑوں کو پھانسی پر لٹکا دیا۔ انہیں جاگیرداروں میں عبد الرحمن خان رئیس جھجر اور راجہ بلب گدہ بھی تھے ان پر یہ الزام تھا کہ اگر کسی انگریز نے بلوایں سے جان بچا کر ان سے پناہ چاہی تو انھوں نے پناہ دی۔ اسی جرم میں ان و دوزوں کو پھانسی دے دی گئی اور ان کی جاگیر وغیرہ سب ضبط کر لی گئی قصہ مختصر روزانہ لوگ گرفتار ہو کر آتے تھے اور سزائیں پاتے تھے۔ بعض چھوڑ بھی دیئے جاتے تھے۔ مجر ہر چہار طرف چھوٹے ہوئے تھے اور انعام کے لالچ میں لوگوں کو گرفتار کراتے تھے۔

۲۴ فروری ۱۸۵۷ء کو بدھ کے روز لارنس صاحب چیف کمشنر پنجاب دہلی میں داخل ہوئے جو لوگ مشہور میں گرفتار تھے ان کو چھوڑ دیا گیا حقیقتہً دہلی کی فتح میں انھوں نے بہت کافی حصہ لیا اور رسد و خزانہ و فوج وغیرہ سے بہت امداد کی اگر یہ امداد نہ کرنے تو گوروں کی قلیل فوج سے دہلی کا فتح کرنا نہایت شہوار تھا ان کی ان خدمات کے صلہ میں کمپنی نے ہندوستان کو حکومت پنجاب کے ماتحت کر کے صاحب موصوف کو لفٹنٹ گورنر کر دیا صاحب موصوف کے تشریف لانے کے تین دن بعد دہلی میں دربار عام منعقد کیا گیا اور تمام مظلوموں اور درو مندوں حاجت مندوں نے اپنی عرضیاں پیش کیں صاحب موصوف نے نہایت ہر بانی سے لوگوں کی عرضیاں لے کر اہلکاروں اور منشیوں کے سپرد کر دیں اس کے بعد مقدمات کی سماعت کے لیے ایک عدالت مقرر ہوئی جس میں چار انگریز تھے چونکہ اس سے پیشتر ایسا ہو چکا تھا کہ مجر د کی مجبوری پر سینکڑوں بگینا ہوں

کو پھانسی دیدی گئی تھی۔ اس وجہ سے اب یہ طے ہوا کہ جب تک چاروں حاکم فیصلہ پر متفق نہ ہوں سزا نہ دی جائے اس دن سے سوائے مجرموں کے کسی کو سزا نہ دی گئی اور سینکڑوں بے گناہ قیدی چھوڑ دیئے گئے۔

صاحب موصوف ابھی دہلی کا انتظام نہ کرنے پائے تھے کہ پنجاب کے بلوہ کی خبر پھونچی اور صاحب مدوح مارچ ۱۸۵۷ء کے آخر میں وہاں کے انتظام کے لیے سائڈرس صاحب اور حکیم احسن اللہ خان کو لے کر چلے گئے سائڈرس کزنال سے واپس چلے آئے اور حکیم احسن اللہ خان مجرموں کی شناخت کر کے پانی پت سے دہلی میں واپس آگئے اور جگام ان کے سپرد تھا اس میں مصروف ہو گئے۔ جان ہٹکف صاحب کشتہ بیمار ہو کر چھ ماہ کی رخصت پر ولایت چلے گئے۔ ان کی جگہ پر مرنی صاحب مقرر ہوئے یہ چاروں صاحب شہر کا بہت اچھا انتظام کر رہے ہیں اب تک لوگ شہر سے باہر پڑے ہوئے ہیں اور ہزاروں نے دیہات و قصبات میں سکونت اختیار کر لی ہے۔ الغرض ان فلک کے ستارے ہوئے مصیبت زدوں نے جو نہ دیکھا تھا وہ دیکھا اور جو کبھی نہ سنا تھا وہ اب سنا کیا کیا مصیبتیں تھیں جو دہلی کے رہنے والوں کو نہ اٹھانی پڑیں گھر ویران ہو گئے۔ سینکڑوں بیویاں ہو گئیں ہزاروں بچے یتیم ہو گئے جیسی بربادی دہلی کی ہوئی اور جیسی رعایا یہاں کی بے گھری بے دری ہوئی ہے کہیں کی نہ ہوئی ہوگی۔ اور جو مظالم دہلی کی فتح کے بعد دہلی میں ہوئے ایسے کہیں نہ ہوئے ہونگے۔ کچھ شک نہیں کہ باغیوں کے مظالم بہت سخت تھے اور ماخوذوں نے انگریز عورتوں اور بچوں کو بڑی بڑی سفایوں سے قتل کیا تھا مگر دہلی کی فتح کے بعد انگریز جیسی سختی کر رہے ہیں وہ بھی افسوسناک ہے اور انگریزوں کی

انصاف پروری کے خلاف ہے۔

کیا دہلی کے انگریز افسروں کو یہ بات معلوم نہ ہوئی ہوگی کہ بے گناہ اور شریف خواتین جن میں جوان بھی ہیں بوڑھی بھی ہیں اور ان کے ساتھ چھوٹے چھوٹے معصوم بچے بھی ہیں۔ دہلی کے باہر جنگلوں میں مارے مارے پھرتے ہیں نہ ان کے پاس کھانا ہے نہ کپڑا ہے۔ نہ رات کو سونے اور دن کو وہرپ سے بچنے کا ٹھکانہ ہے۔

دہلی کے افسروں نے ان کو ان کے گھروں سے اس لیے نکال دیا ہے کہ مال اسباب جمع کیا جائے۔

دہلی کے ایک لاکھ مکان مسلمان ہو کر کھنڈر بن گئے ہیں اور یہ آباد شہر ایسا ویران ہو رہا ہے کہ دیکھنے سے رونا آتا ہے۔

مگر میرا خیال ہے کہ چونکہ ابھی اودھ اور بریلی اور میرٹھ اور رڑکی اور انوپ شہر وغیرہ مقامات پر لڑائیاں ہو رہی ہیں اور بغاوت قائم ہے اس لیے دہلی کے افسر لوگوں کو مرعوب کرنے کے لیے ایسی سختیاں کر رہے ہیں اور ان کو باغیوں کے مرکز شہر کو اچھی طرح دبا کر انتظام کرنا مقصود ہے جو کچھ بھی ہو موجودہ حالت تو بہت ہی دردناک اور افسوسناک اور رونے کے قابل ہے۔

دہلی کی پچاسیاں اور گرفتاریاں اب کچھ حال عائدین شہر دہلی کا بھی سینے (۱) ۱۷ اکتوبر کو سینچر کے دن عبدالرحمن خان رئیس ٹھیکر گرفتار کیے گئے کچھ دن دیر ان عام میں قید رہے پھر ان کو پھانسی دیدی گئی اور سب علاقہ وغیرہ ضبط کر لیا گیا۔

(۲) ۲ نومبر کو بلب گڈہ کے راجہ ناہر سنگھ بھی پکڑے گئے ان کو بھی پھانسی ہوئی۔

(۳۳) میاں غلام نظام الدین صاحب حضرت غلام نصیر الدین عرف کا لیصا کے بڑے صاحبزادے جو حضرت مولانا فخر الدین رحمۃ اللہ علیہ کے خاندان سے ہیں جن کی تاریخ وفات ”چراغ دین“ ہے۔ (اس جگہ سے ایک ورق اصل کتاب نہیں ہے۔ شاید گم ہو گیا ہو۔ حسن نظامی) گرفتاری کے خوف سے چند روز قدم شریف کی درگاہ میں بحالت پریشانی بسر کی بعد چند روز کے بلغم گدہ کی طرف چلے گئے اور کچھ دن وہاں قیام کر کے گوالیار چلے گئے۔ بعض لوگ کہتے ہیں کہ گوالیار سے حیدر آباد چلے گئے۔ بعض لوگ کہتے ہیں کہ اپنے قیدی وطن اورنگ آباد کو چلے گئے اور ان کے تمام عزیز و اقارب قید سے رہائی پا کر حکیم محمد خان اور حکیم تفسی خان کے ہمراہ بیٹا لہ جا کر آباد ہو گئے۔

(۳۴) اور نواب غلام محی الدین خان عرف بڈ ہے صاحب رئیس جن کی ایک ہزار روپیہ پنشن کلکٹری سے تھی اور تین سو روپے مہینہ ریاست بھرت پور سے تھے اور پانسو روپیہ کرایہ مکان و دوکانوں اور دیہات و باغات وغیرہ کا تھا اور وہ امیرانہ بھٹا سے رہتے تھے اس ہنگامہ کے زمانہ میں مرزا مغل کے پاس کبھی کبھی جایا کرتے تھے اس لیے جس دن انگریزی فوج دہلی میں داخل ہوئی۔ اور انگریزی فوج کے آدمی شہر کے بندوبست اور مجرموں کی تلاشی میں چاروں طرف پھرنے لگے تو نواب صاحب موصوف جان کے خوف سے ننگے سر ننگے پاؤں شہر سے نکل کھڑے ہوئے چند روز درگاہ قدم شریف میں رہے پھر بلغم گدہ میں قیام کیا اور وہاں سے گوالیار چلے گئے اور وہیں انتقال کر گئے لیکن اکثر لوگ کہتے ہیں وہ ابھی زندہ ہیں اور میاں نظام الدین صاحب کے ساتھ حیدر آباد لے سلسلہ کلام سے معلوم ہوتا ہے کہ گم شدہ ورق کے دونوں صفحات میں میاں نظام الدین صاحب کا حال ہر گاہ کیونکہ اس ورق میں بھی وہی سلسلہ ہے۔ حسن نظامی

چلے گئے ہیں خدا جانے سچ ہے یا جھوٹ ۔

(۵) حکیم صادق علی خان کے بیٹے حکیم محمود خان اور حکیم ترضی خان جو بہشت زانی آدمی ہیں اور حکیم ترضی خان مدت سے ریاست پٹیالہ میں اپنے بڑے بھائی غلام محمد خان مرحوم کی جگہ پر مقرر ہیں اور محمود خان اپنے والد کی جگہ مستط کرتے ہیں جب انگریز فوج دہلی میں داخل ہوئی تو ان دونوں مساجدوں نے لوگوں کے ساتھ بہت امدادی کی جن کا شکریہ ادا نہیں ہو سکتا۔ تمام اہل محلہ اتر با و احباب بلا امتیاز امیر و غریب تقریباً پانسو آدمیوں کو اپنے گھر میں رکھا اور جب حکمت ہنگامہ فرو نہیں ہوا سو وقت تک ان کی ہر طرح خبر گیری اور خاطر مدارات کرتے رہے ایک دن کسی مخبر کے مخبری کرنے پر سب آدمی جو حکیم صاحب کے یہاں ٹہرے ہوئے تھے گرفتار ہو کر کوٹوالی چلے گئے حکیم صاحب موصوفہ ہی ان کے ہمراہ تین دن تک کوٹوالی میں مقید رہے اور بڑی جانفشانی سے ان سب کو چھڑایا اور چند روز کے بعد سب کو ساتھ لے کر ریاست پٹیالہ میں چلے گئے ۔

(۶) چھوٹا رامل کے بیٹے لالہ ہمیش داس اور لالہ پالامل کے بیٹے لالہ چمنامل بھی شہر کے سربراہ اور وہ ساہوکاروں میں ہیں اور بڑے خوش معاملہ اور مخبر لوگوں میں سے ہیں غدر کے زمانہ میں ان بے چاروں کا لاکھوں روپیہ کا سامان باغیوں نے کلکتہ کے راستہ میں لوٹ لیا اور باغی کی باران کی کوٹھی لوٹنے کی غرض سے چڑھ آئے لیکن ان لوگوں نے حکمت عملی سے اپنے آپ کو لوٹنے سے بچا بچا لیا کئی بار مرزا مغل اور مرزا خضر سلطان نے باغیوں کو رو دینے سے ان لوگوں سے بزور روپیہ

۱۔ حکیم محمود خان صاحب سچ الملک حکیم محمد جل خان مرحوم کے والد تھے۔ حسن نظامی

۲۔ چاندنی چوک دہلی میں نیل کا کٹرہ ایک محلہ ہے وہاں اس خاندان کے ہندو اب تک

خوش حالی سے زندگی بسر کرتے ہیں۔ حسن نظامی

لینا چاہا لیکن انھوں نے ایک پیسہ نہیں دیا اور آجکل آجکل کر کے مٹاتے رہے۔ دوسری عقل مندی انھوں نے یہ کی کہ روز روز کی چھریں دہلی کی اور بادشاہی دربار کی پہاڑی پر انگریزوں کے پاس پہنچاتے رہے اور جب تک دہلی فتح ہوئی انگریزوں کی خیر خواہی میں انھوں نے کوئی دقیقہ اٹھانہ رکھا جب دہلی فتح ہوئی تو ان کی سرکار انگریزی میں بڑی عزت ہوئی یہ لوگوں بھی بہت شریف ہیں اور مخلوق کی خدمت خواہ ہندو ہو یا مسلمان بہت کرتے ہیں یہی وجہ ہے کہ غریبوں کی دعا کے اثرات کثرت مل جہاں یہ رہتے ہیں لٹنے سے محفوظ رہا۔ فی الحال مسرٹ کا عہدہ ان کو ملا ہے۔

(۷) **نہنہ جی اور مناجی** چندار راجہ امید سنگھ مرحوم کے بیٹے بہت عزت دار اور متوسلان شاہی سے ہیں۔ مناجی کو پتنگ بازی کا بہت شوق تھا اور اکثر مریض رہتے تھے غدر میں تلنگوں نے ان کا مکان لوٹ لیا۔ چند دن کے بعد طرح طرح کے افکار اور پریشانیوں میں مبتلا رہ کر انتقال کر گئے۔ دوسرے بہائی نہنہ جی بہت ہوشیار اور سمجھ دار آدمی ہیں غدر میں یہ بھی برباد ہو گئے لیکن انگریزی عملداری میں اپنی ہوشیاری اور دانائی سے خیر خواہان سرکاری میں داخل ہو گئے۔ دسمبر ۱۸۵۷ء میں پندرہ ہزار تین سو روپے نقصان سرکار انگریزی سے وصول کر لیتے۔

(۸) **نواب مظفر الدولہ حسین مرزا** یہ دونوں حقیقی بھائی نواب حسام الدین حیدر علی ان کے وارثوں کا حال معلوم نہ ہو سکا مگر یہ آخری عہدہ میں درج ہو سکے۔ جن نظامی حاشیہ دار راجہ بہادر شاہ خلیفہ راجہ بگرام داروغہ اہلک شاہ دادہ جس دن انگریزی فوج دہلی میں داخل ہوئی اپنے قریبی مکان میں جو کالی دروازہ ہے وہاں پہلے اپنے نوکر دلیتمیت جو سینگتہ بیٹے ہوئے کہ گوردی دوزخ میں آئے تھے اور راجہ خانا اور ان کے بیٹے لالہ کو قتل کر دیا۔

ابن آغا شفیق خان کے بیٹے تھے ان میں سے ایک نواب مظفر الدولہ تو گھر میں بیٹھ رہتے تھے دوسرے بھائی حسین مرزا بہمدہ نظارت قلعہ شاہی میں متعین تھے یہ دونوں بھائی بہت خاندانی اور لائق و ہوش مند تھے یہ سچا سے بھی جان کے در سے مکان چھوڑ کر بھاگ گئے تھے لیکن مظفر الدولہ تو آئور سے گرفتار ہو کر آگے اور گورکھ پور میں دوسرے لوگوں کے ساتھ فوٹ صاحب کلکٹر گورکھ پور کے حتم سے ان کے کوئی مار دی گئی دوسرے بھائی حسین مرزا ناظر مقام برہٹ کو چلے گئے کچھ دن بعد نامینا ہو گئے ان کے دو بیٹے تھے ایک طالع یار خان دوسرے اصغر یار خان یہ دونوں ایسے حسین نوجوان تھے کہ دہلی میں ان کا مثل نہیں تھا جس وقت یہ گھوڑے پر سوار ہو کر نکلتے تھے تو لوگ سکتہ کے عالم میں رہ جاتے تھے یہ دونوں بھائی بھی گہنا شام چیر اسی آکھٹی جے پور اور مسی سپہدار خضر پور کی مخبری کرنے سے آئور سے بے گناہ گرفتار کر کے لائے گئے ان دونوں بھائیوں نے ہر چند مخبروں کی خوشامد کی لیکن ان ظالموں نے ایک نہ سنی اور ایک سو آٹھ قیدیوں کے ساتھ ان کو بھی دہلی بھیج دیا اور وہ ہینہ جیل خانہ کی مصیبت جھیلنے کے بعد بغیر تحقیقات کے بالکل بے گناہ اور بے قصور دونوں کو پھانسی دیدی گئی ان کے پھانسی پانے سے اہل شہر کو سخت رنج و افسوس ہوا ان کے پھانسی پانے کے بعد جو حال ان کے باپ حسین مرزا کا ہوا وہ ناقابل بیان ہے۔ بقیہ عمر روتے ہی رہے۔

(۹) نواب میر خان نیشن دار غلط نواب مرتضیٰ خان جاگیر دار پلہل مہ اپنے

۱۔ برست ضلع کرنال میں شیعوں کا گھاؤں ہے۔ حسن نظامی

۲۔ نواب اسحق خان صاحب مرحوم رئیس جہانگیر آباد و سرکڑی علی گڑھ کا لڑکے

حسن نظامی

قرابت دار تھے۔

نورجان بیٹے عثمان خان عرف و مولانا اور سے گرفتار ہو کر آئے اور اس جرم میں کہ مرزا عبداللہ کے دربار میں حاضر ہوتے تھے پھانسی دی گئی ان کے اہل عیال حیران پریشان ہو کر جاوہ چلے گئے اور وہیں سکونت اختیار کر لی ۔

(۱۰) نواب یعقوب علی خان ابن شجاعت خان جو نواب نجیب خان اہل وائی کثیر کے خاندان سے ہیں اور بہت مسکین طبیعت آدمی ہیں جس دن سے غدر پڑا انھوں نے بھول کر بھی گھر میں سے قدم نہیں نکالا لوگوں نے ان کو بہت ترغیب دی کہ دربار شاہی میں شریک ہوں لیکن انھوں نے بوجہ نما خوار ہو کر انگریزی دربار شاہی میں شریک ہونے سے انکار کر دیا یہ بچارے بارہ برس سے قرض خواہوں کے اجراء ڈگری کے دُورست گھر میں بیٹھے رہتے تھے چار سو روپے پنشن تھی لیکن بہت کیشرالا دلاتھے ہمیشہ مقروض رہتے تھے جس دن انگریزی فوج داخل ہوئی تو اپنے اہل و عیال اور اسباب سمیت دہلی سے بھاگ کر قطب صاحب کے راستہ میں ان کو گوجروں نے مدد ان کے بڑے بیٹے قطب علی خان کے قتل کر دیا اور سب مال اسباب لوٹ لے گئے ان کے متعلقین جو باقی رہ گئے ہیں ان کا حال بیان کرنے سے کلیجہ کا پتلا ہے ۔

(۱۱) نواب اکبر خان ابن فیض اللہ خان بنگش جن کی دوسو پچاس روپے پنشن سرکار سے مقرر تھی اور ایک سو روپے ان کی بیوی کی پنشن تھی بڑے فضول خرچ اور جستے کے عادی تھے ہمیشہ قرضدار رہتے تھے اور قرض خواہوں کے خون سے گھر میں بیٹھے رہتے تھے کرایہ وغیرہ کی آمدنی مقبول تھی یہ بچارے بھی جو لوگ الور سے گرفتار ہو کر آئے تھے انہی کے ساتھ گرفتار ہو کر آئے اور گورنگاؤں میں ان کو بھی پھانسی دے دی گئی ان کے بیٹے فیض محمد خان عرف بدہن بچے گئے اور ان کے

متعلقین کو لے کر اجیمیر شریف چلے گئے معلوم نہیں وہاں کہاں رہتے ہیں ۔

(۱۲) مسمی احمد مرزا خلف محمد حاجی ان کے باپ تو مرچکے تھے لیکن یہ اپنی چالاکی اور ہیشیاری سے شہر کے بڑے لوگوں میں شمار ہوتے تھے۔ مرزا منحل کے مشیر خاص تھے اور شہزادوں کے پاس بھی ان کی نشست و برخاست تھی چیلوں کے کوچہ میں رہتے تھے یہ بھی الور سے گرفتار ہو کر آئے اور گورکانوں میں مارے گئے ۔

(۱۳) مسمی امیر محمد حسین میر خیر زئی سرشتہ دار محکمہ اکبختی کے بیٹے بڑے بھائی بھر کم آدمی تھے۔ اور بہت تمول تھے پہلے ریاست آلور میں مرزا اسفندیار بیگ کے علاقہ پر ملازم تھے اکثر بخت خان جو نیل فوج شاہی کی صحبت میں آتے جاتے تھے اور عہدہ پانے کی امید میں قلعہ میں بھی جاتے آتے تھے ان کے کوئی اولاد نہیں تھی روپیہ پیسہ بہت تھا مگر بڑے خسیس تھے الور سے یہ بھی گرفتار ہو کر آئے قریب دو دہینہ کے کوٹوالی میں قید رہے بعد میں ان کو بھی پھانسی دیدی گئی۔

(۱۴) مرزا فاضل بیگ محمد بیگ کے بیٹے چیلوں کے کوچہ میں رہتے تھے ان کے خاندان کے لوگ صاحب علم تھے اور یہ خود بھی صاحب علم اور بہت صحبت یا آدمی تھے قلعہ میں بہت زیادہ جاتے آتے تھے پہلے مرزا شاہ رخ مرحوم کے ملازم ہوتے پھر رسوخ پیداکر کے شرافت محل والدہ مرزا منحل کے مختار اور کاپر داز ہو گئے اور بہت کچھ روپے پیدا کر لیا یہ بھی جان کے خوف سے دہلی سے بھاگ گئے ان کا اشتہار گرفتاری جاری ہوا لیکن ان کا کچھ پتہ نہیں لگا اور یہ گرفتاری سے بچ گئے ان کے چھوٹے بھائی مرزا جان بیگ عذر سے ایک سال پہلے حج کو چلے گئے تھے۔ جب یہ ہنگامہ فرو ہوا تو مدنی میں واپس آئے

اور وہاں سے کچھ دن قیام کر کے اندور گئے۔ اندور سے ہملٹن صاحب کی سفارشی چٹھی لکھو کر دہلی کے حکام کے پاس بھیجی حکام دہلی نے ہملٹن صاحب کی سفارش پر ان کی جائداد وغیرہ واکزاشت کر دی کچھ دنوں بعد یہ خود دہلی آگئے اور عرب سرائے کے قریب رہنا اختیار کیا اور اپنے مقدمات کی پیریز شروع کی ۰۰

(۱۵) حکیم عبدالحق ابن حکیم حسن بخش۔ یہ چند سال تک بلم گڑھ کی دیوانی پر مقرر ہوا جب خوب روپیہ پیدا کر لیا اور بہت مالدار ہو گئے تو ملازمت سے استعفاء دے کر اپنے گھر آگئے اور فارغ البالی رہے اپنی زندگی بسر کرنے لگے ان کا اکثر سید حامد علی خان کے یہاں احمد مرزا اور راجہ جے سنگھ راؤ کے رحوں کی وجہ سے آنا جانا رہتا تھا اس لیے ان کو پھانسی دی گئی ۰۰

(۱۶) ایک شخص قاضی فیض اللہ کشمیری جو اٹھارہ سال تک صدر الصدور کی کچہری میں سررشتہ دار رہے جان پائن گمنس صاحب بخش راج دہلی کے زمانہ میں رشوت ستانی کے الزام میں معزول کئے گئے ملازمت سے بطرف ہونے کے بعد سوداگری کا سلسلہ کر لیا تھا اور خوب آرام سے رہتے تھے باغیوں کے دور میں دہلی کے کوتوال ہو گئے جب انگریزی عملداری ہوئی تو ان کو پھانسی دے دی گئی ۰۰

(۱۷) عبدالکلیم خان نائب کوتوال نے جو یہ حالت دیکھی تو وہ اپنا گھر بار چھوڑ کر الور بھاگ گئے پھر الور سے کہیں اور چلے گئے۔ ان کی گرفتاری کیلئے اشتہا ہو گیا۔ لیکن یہ بہت دنوں تک روپوش رہے۔ جب یکم نومبر ۱۸۵۷ء کو ملکہ وکٹوریہ کا مجرموں اور فسادوں کی معافی کیلئے اشتہا جاری ہوا تو پھر یہ خود ۲۴ دسمبر ۱۸۵۷ء کو دہلی کی کٹھن دہلی کے پاس حاضر ہو گئے اس وقت تو حالات کر دیتے گئے لیکن آخر جنوری ۱۸۵۹ء میں چھوڑ دئے گئے لیکن جائداد ضبط ہو گئی ۰۰

(۱۸) منشی آغا جان : دونوں محکمہ لکھنؤ میں محسوس رہے انھوں نے بھی خوب روپیہ پیدا کیا پھر استغفار دے دیا یہ بڑے مخیر آدمی تھے صبح شام ان کے ہاں خیر جاری تھی جب انگریز دلی میں گھس آئے تو یہ بچارے بھی شہر چھوڑ کر بھاگے چند مہینہ پریشان حال پھرتے رہے کبھی اس گاؤں میں کبھی اس گاؤں میں جبہ بالکل تباہ و برباد ہو گئے تو حضرت سلطان جی میں آکر قیام کیا کسی مخبری کر دی کہ یہ تو جہادیوں کو کھانا وغیرہ کھلاتے تھے آخر بچارے گرفتار ہو گئے کچھ دنوں کو توالمی میں قید رہے لیکن پھر چھوڑ دیئے گئے ۔

(۱۹) صفدر سلطان ابن نواب مرزا بخش محمود خان مرحوم کے نواسے تھے اور خود بھی بخشی تھے جب تک بادشاہ دہلی میں رہے یہ اپنے عہدہ پر قائم رہے لیکن پھر یہ بھی بھاگے بہت دنوں تک ان کا پتہ نہیں چلا۔ اب نواب رامپور کے پاس اپنی سفارش کے لئے گئے ہیں ۔

(۲۰) ایک شخص میاں امیر صاحب خوشنویس بہت طاقتور اور لمبے رڑنگے آدمی تھے چوڑا نوے برس کی عمر تھی مگر پنجہ میں بڑی طاقت تھی بے مثل خوشنویس تھے اور اپنے زمانہ کے کامل الفن استاد سمجھے جاتے تھے انگریزی فوج کے ایک سپاہی کی گولی سے شہید ہو گئے ۔

(۲۱) مولانا مولوی صدر الدین خان ۳۵ سال سے انگریزوں کے ملازم تھے۔

۳۵ میر خجاش کے نام سے دہلی میں مشہور ہیں ان کی اولاد موجود ہے جامع مسجد کے قریب آباد ہے۔ حسن نظامی

بڑے بڑے عہدوں پر رہے اب پچیس سال سے دہلی کے صدر الصدور تھے۔
 بڑے ایمان دار حاکم تھے اہل مقدمہ ہمیشہ ان کے انصاف سے خوش رہتے تھے۔
 سرکار انگریزی کے بہت خیر خواہ تھے جب غدر میں کچھریاں اور دفتر جلا کر خاک
 سیاہ کر دیئے گئے تو یہ بھی گھر میں بیٹھ رہے پھر بادشاہ کے بلا سن سے مجبور
 ہو کر جبراً قلعہ میں عدالت کا کام کرنے لگے انگریزوں کے قتل کے فتوے پر
 انھوں نے ہی باغیوں کے جبر سے ہر لگا دی جب انگریزوں کا تسلط ہوا تو یہ
 بھی اسی جرم میں گرفتار ہو گئے لیکن چونکہ پہلے بڑی نیک نامی اور دیانت سے
 ملازمت کر چکے تھے لہذا سابقہ کارگزاریوں کے باعث خدہ ہمیشہ نظر بند رہ کر رہا
 ہو گئے۔ پھر دو گاہ حضرت نظام الدین یامیں ایک مختصر مکان لیکر وہیں رہنے لگے۔

(۲۲) حافظ داؤد قلعہ میں مسلم تھے پھر لکھنؤ چلے گئے ان کی میڈ ہو صاحب
 رسالہ سے بہت قریبی رشتہ داری تھی اس وجہ سے وہاں بہت کچھ روپیہ
 پیسہ پیدا کر کے دہلی چلے آئے اور یہاں امیرانہ طریقہ سے رہتے تھے۔ یہ بھی
 گرفتار ہو کر کوتوالی میں بند کئے گئے لیکن ایک ہزار کی ضمانت پر رہا ہو گئے۔

(۲۳) نواب سید حامد علی خان رئیس برست یہ میر فضل علی خان نائب شاہ
 اودھ کے داماد تھے جب ان کے خسر کا انتقال ہو گیا تو ان کی بیوی کو اپنے
 باپ کے ترکہ سے نوازا کہ وہ پیسہ نقد اور بہت سامان ملا سید حامد علی خان نے
 وہ روپیہ سرکاری خزانہ میں جمع کر دیا جس میں سود ساڑھے چار ہزار روپے
 ماہوار ملتا تھا لیکن چند سال سے فضول خرچیوں میں سب روپیہ برباد کر دیا
 پھر حسین بخش سوداگر کے مشورہ سے دہلی کے قلعہ میں داخل ہو کر نائب مہر رہے۔

اور بادشاہ کو خوب لوٹا پھر لکھنؤ چلے گئے وہاں قید کر لیے گئے جو کچھ روپیہ باقی تھا وہ پرگنہ برار اور گونڈہ کی بقایا میں دے دیا وہاں سے رہائی پا کر پھر دہلی چلے آئے یہاں راجہ دیپ سنگھ ساگ رام احمد مرزا جان اور مرزا فاضل بیگ حکیم عبدالحق اور میر تقی فضل حسین کیل کی صحبت میں رہنے لگے غدر کے زمانہ میں مرزا منگل اور مرزا ابوبکر کے پاس بہت آتے جاتے تھے اس لیے یہ بھی برست سے گرفتار ہو کر آئے ان کے ساتھ ان کے ہم زلف میر حیدر حسن خان کے تین لڑکے سردار مرزا عباس مرزا اور وزیر مرزا بھی کو توالی دہلی میں مقید رہے ان میں سے سردار مرزا خیر ماہ اپریل ۱۸۵۷ء میں چھوٹ گئے اور نواب حامد علی خان فردوسی ۱۸۵۷ء میں چودہ ہینہ حالات میں رہ کر دوسروں کی ضمانت پر رہا ہوئے قید سے رہا ہونے کے بعد انھوں نے شہر سے باہر ایک مکان لے کر سکونت اختیار کی ۔

(۲۴) نواب احمد قلی خان نواب عباس قلی خان مرحوم کے بیٹے تھے ان کی بیٹی نواب زینت محل بیگم بادشاہ کی بیگم تھیں بادشاہ کے خسر تھے اور بہت نامور لوگوں میں سے تھے جس دن انگریز دہلی میں داخل ہوئے ہیں تو یہ بھی بھاگے لیکن جھجھر سے پکڑے ہوئے ان سے بڑھاپے کی وجہ سے قید کی سختیاں برداشت نہ ہو سکیں آخر جیل خانہ ہی میں انتقال ہو گیا ۔

(۲۵) نواب محمد حسین خان خلف نواب القی خان مرحوم۔ ان کی کل عمر سی سے دوسو روپے پنشن بھی عیش و آرام سے بسر کرتے تھے صحبت خراب تھی اکثر شرابیوں جویوں میں اٹھتے بیٹھتے تھے اسی وجہ سے بہت قرضدار رہتے تھے۔

غدر میں مرزا خضر سلطان کے نائب ہو گئے تھے اسی جرم میں جھجھر سے گرفتار ہو کر کچھ عرصہ قید رہے اور پھر پھانسی دے دی گئی۔ یہ پکارے کثیر الاولاد تھے ان کے بعد ان کے متعلقین بہت تباہ و پریشان پھرتے ہیں ۰

(۲۶) حکیم شرف الدین خان مرحوم کے نوجوان بیٹے نظام الدین خان اور استاد ذوق کے بیٹے خلیفہ اسماعیل چند دوستوں کے ساتھ قدم شریف سے گرفتار کر لیے گئے ایک رات کو توالی میں رہے دوسرے دن بالکل بے تصور اور بے گناہ پھانسی دے دی گئی حالانکہ ان پر کوئی ثبوت نہ تھا ہر شخص ان کی بیگناہی کا رنج کرتا تھا ۰

(۲۷) مرزا معین الدین حسن خان پہاڑ گنج کے تھانہ دار تھے ان کے چھوٹے بھائی محمد حسین خان بدر پور کے تھانہ دار تھے یہ دونوں بھائی تین دن بلوہ کے زمانہ میں شہر کی کوتوالی پر مامور رہے پھر مرزا مغل کے نائب ہو گئے اکثر معرکوں میں باغیوں کی طرف سے شریک رہے جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ گھر بار چھوڑ کر ہمیشہ کے لیے مالاوہ کی طرف چلے گئے ۰

(۲۸) لالہ راجحید اس گڑ واسی بہت خلیق اور وفادار آدمی تھے ساہیواریوں میں ان کی جبری عزت تھی کاروبار بھی ان کا خوب چلتا تھا بڑے نازک تحفہ الجشتہ سلاہ نواب قدرت اللہ بیگ خان کے بڑے بیٹے تھے۔ ان کو نواب سالاہ جنگ نے حیدر آباد کن میں نوکری دے دی تھی۔ حسن نظامی

۰ ان کی اولاد اب بھی دہلی میں مسز نہ سمجھی جاتی ہے حسن نظامی

انگریزوں میں رہتے تھے سرکار انگریزی میں بھی ان کی بہت عزت تھی بلکہ زمانے میں یہ بھی مرزا مغل اور مرزا خضر سلطان کے ہاتھوں بہت پریشان رہے۔ جب انگریزی عملداری ہوئی تو یہ بھی اور ساہوکاروں کے ساتھ شہر چھوڑ کر چلے گئے لیکن سفر اور پریشانی کے متحمل نہ ہوئے اور مر گئے ان کے بعد ان کے بیٹے نرائن داس ان کی گدی پر بیٹھے یہ بھی اپنے باپ کے قدم بقدم چلتے ہیں ان کی ایمانداری کی ایک مثال تو یہ ہے کہ نواب محبوب علی خان کا بیالیس ہزار روپیہ ان کی کوٹھی میں جمع تھا اور انگریزوں کو بیس ہزار روپے کا سرخ ملا جب لارنس صاحب چیف کاشنر دہلی میں آئے اور ان سے روپے کے بارہ میں سوال کیا گیا تو انھوں نے بیالیس ہزار کا اقرار کیا ان کی سیجانی سے انگریز بہت خوش ہوئے اور ان کو کرسی دی گئی۔

(۲۹) ضیاء الدولہ خلف حکیم رکن الدولہ بہت امیر کبیر تھے ان کی آمدنی دوکانوں اور باغات وغیرہ کی قریب چار سو روپے کے تھی امیرانہ ٹھاٹھ سے رہتے تھے جب گورے دہلی میں گئے تو یہ بھی دہلی چھوڑ کر بھاگے مگر راستہ میں ان کا سب مال اسباب گوجروں نے اور انگریزی سپاہیوں نے لوٹ لیا۔ یہ بچارے صرف جان بچا کر مع چند عورتوں بچوں کے پانی پت چلے گئے کچھ عرصہ کے بعد وہاں سے گرفتار ہو کر آئے لیکن بے قصور سمجھ کر سو روپے کی ضمانت پر چھوڑ دیئے گئے اور اپنے موروثی مکان میں رہنے لگے۔

۵۔ ان کے ورثا حیدر آباد میں لو کر رہے اور اب بھی ہیں۔ اور ان کی قبریں درگاہ حضرت خواجہ نظام الدین اولیاءؒ میں میرے مکان کے برابر واقع ہیں۔

حسن نظامی

(۳۰) موسیٰ خان ابن حافظ عبدالرحمن خان مرزا نیلی مرحوم کے ہاں مختار تھے یہ کبھی مالدار تھے اور تقریباً ڈیڑھ سو روپیہ کرایہ وغیرہ کی آمدنی تھی الور سے گرفتار کر کے لائے گئے قریب تین مہینہ کے کوتوالی میں حالات رہے پھر پانسو روپے کی ضمانت پر رہا ہوئے ان کی جائیداد وغیرہ ضبط ہو گئی اسی پران کی گزربسہر اب بھوجلا پہاڑی پر ایک شخص کے مکان میں رہتے ہیں ۔

(۳۱) نواب نبی بخش خان بھی نامور لوگوں میں سے ہیں انھوں نے نمک حرام تلمنگوں کے عہد میں بادشاہ کو ایک عرضی اس مضمون کی لکھی تھی کہ ہمارے مذہب میں عورتوں اور بچوں کا قتل ممنوع ہے اور کبھی کسی مذہب میں جائز نہیں ہے اگر حضور میوں اور ناکردہ گناہ بچوں کے قتل سے باغیوں کو روکیں تو یہ بات حضور کے حق میں دنیا اور عقبی میں بہتر ہوگی جب دہلی فتح ہوئی تو اتفاق سے یہ عرضی دفتر سے برآمد ہوئی اس صلہ میں نواب صاحب کو پانسو روپیہ انعام ملے اور سرکاری خیر خواہوں میں ان کا شمار ہو گیا ۔

(۳۲) نواب القضا خان غلط نواب مرتضیٰ خان مرحوم جاگیر ابراہیم گنہ پل پل بہت بدچلن آدمی تھے کوئی پندرہ برس سے حکیم نور الدین صاحب کی صحبت نے ان پر ایسا اثر کیا کہ ان کی عادتیں بالکل بدل گئیں ۔ بڑے نمازی اور پرہیزگار ہو گئے غدر کے زمانہ میں یہ اپنے چند دوستوں کے ساتھ جو انگریزی فوج میں ملازم تھے دہلی سے چلے کچھ دن انہیں سواروں کے ساتھ چھرتے رہے پھر میرٹھ چلے گئے اور وہیں لے ان کے بیٹے کا نام احمد حسین خان تھا نواب کلب علی خان نے تیس روپے ہمارا مقرر کر دیئے تھے ۵۰ روپیہ میں انہی کی مسجد ہے ۔ ان کی اولاد اب بھی دہلی میں ہے ۔ حسن نظامی

سکونت اختیار کر لی ۔

(۳۳) محمد علی خان خلف نواب شیر جنگ خان چیلوں کے کوچہ میں رہتے تھے بہت خوبصورت جوان تھے چار سو روپے کی آمدنی نواب بہادر جنگ خان کے ہر گنہ سے مخفی خوب عیش و عشرت سے بسر کرتے تھے جب انگریز شہر میں گیسے تو یہ گھر میں ہی رہے آخر بندوق کی گولی سے شہید ہو گئے ۔

(۳۴) عبدالصمد خان ابن علی محمد خان بادشاہ کی فوج میں رسالدار تھے یہاں سے ملازمت چھوڑ کر واجد علی شاہ کے عہد میں لکھنؤ چلے گئے وہاں کسی ملین کے افسر ہو گئے جب اودھ کی سلطنت متزلزل ہوئی تو یہ پھر دہلی چلے آئے کچھ دن بعد ممن چاک سوار کے ساتھ الور چلے گئے اور وہاں ملازمت کر لی دہلی فتح ہونے سے چند دن پہلے بچا رہے دہلی آئے تھے خود کیا آئے تھے فضا لائی تھی عبدالرحمن خان والی حجہ کے خسر شبیں گرفتار کر لیے گئے کیونکہ ان کا نام بھی صمد خان تھا اور اسی شبہ میں گولی مار دی گئی۔ ان کے بعد ان کے باپ اور ان کے چچا بھی انہیں کے غم میں جلد ہی انتقال کر گئے ۔

(۳۵) نواب جھجھر کے خسر عبدالصمد خان ڈہانی سو سوار لے کر بادشاہ کی مدد کے واسطے آئے تھے اور برائے شاہی فوج کے ساتھ ملکر انگریزوں سے لڑتے رہے جب تلنگ بھاگے تو یہ بھی ان کے ساتھ بھاگے۔ ان کے ساتھ ایک بہت بڑا گروہ ہے اور اب ڈکیتی کرتے پھرتے ہیں ۔

(۳۶) حکیم امام الدین خان ولد حکیم غلام رضا خان حکمت میں اپنے وقت کے شیخ مانے جاتے ہیں اکبر شاہ کے عہد میں شاہی طبیب تھے پانسو روپے ملتے تھے بہادر شاہ کے زمانہ میں سو روپے پاتے تھے نواب زبیرت محل کے معالج تھے عذر کے زمانے میں گھر میں بیٹھ رہے جب سب لوگ شہر چھوڑ چھوڑ کر بھاگنے لگے تو یہ بھی دہلی چھوڑ کر چلے گئے چند روز بعد برن صاحب بہادر کے حکم سے اپنے مکان میں رہنے لگے لیکن پھر جان مٹکا ف صاحب کے حکم سے شہر بدر کر دیئے گئے اور قطب صاحب میں رہنے لگے۔ پھر بدلتی پرشاہ کی سرکار میں ملازم ہو گئے کچھ دن بعد بنارس سے چلے آئے پھر دلی ٹونک کی طلبی پر ستمبر ۱۸۵۷ء میں ٹونک چلے گئے۔

(۳۷) نواب حسن علی خان کے والد نواب نجات علی خان دلی جھجک کا جب انتقال ہو گیا تو ان کے بڑے بھائی نواب فیض محمد صاحب گدی نشین ہوئے ان کے زمانے میں یہ جرنیل تھے۔ جب ان کے بھائی نواب فیض محمد خان کا بھی انتقال ہو گیا تو نواب فیض علی خان گدی پر بیٹھے ان سے ان کی کچھ ان بن ہو گئی یہاں تک کہ مقدمہ بازی کی نوبت پہونچی آخر گورنمنٹ انگریزی کے حکم سے ریاست سے ان کے تین ہزار روپے مقرر ہو گئے جو محکمہ اکینٹی سے مل جایا کرتے تھے اس کے بعد یہ دہلی چلے آئے اور یہیں سکونت اختیار کر لی عذر کے زمانے میں بادشاہ کی خدمت میں ظاہری چالپوسی کی وجہ سے اکثر آتے جاتے تھے جب انگریزی عہداری ہوئی تو یہ پچارے سب مال و اسباب چھوڑ کر تنہا بھاگے اور خدا جانے کس طرف چل دیئے ان کے متعلقین ان کے بددلتا ہی و بربادی کے عالم میں گاؤں گاؤں پر لیٹان پھرتے ہیں ان کے بڑے بیٹے سعادت علی خان بلند شہر سے گرفتار لے غالباً ماہ بنارس کا نام ہو گا کتاب میں اس سے زائد کچھ تفصیل نہیں ہے حسن نظامی

ہو کر آئے۔ چند روز قید رہے و دو ماہ کے بعد رہائی پا کر جادوہ چلے گئے اور وہیں
بعارضہ قلع انتقال کر گئے نواب حسن علی خان بھی یکم جنوری ۱۹۵۹ء کو دہلی آ گئے۔
اور کمشنر صاحب کے حکم سے کلاں محل میں رہنے لگے۔

(۳۸) دلدار علی خان کپتان ساکن دہلی اور میر نواب نائب کپتان مسلمان
نے جب دیکھا کہ ننگے بھاگ نکلے تو یہ دونوں بھی بھاگ گئے۔ میر نواب گرفتار
ہو کر آ گئے لیکن ان کے خسر کمپنی کے فیل خانہ کے واردہ تھے ان کی سفارش سے
یہ چھوٹ گئے اور پھر اپنے وطن چلے گئے دلدار علی خان کی گرفتاری کے لیے
اشتہار ہو گیا کچھ عرصہ بعد پانی پت سے گرفتار کر کے لائے گئے۔ ۱۹۵۸ء
۱۹۵۸ء کو پھانسی ہو گئی۔

(۳۹) میاں حسن عسکری ایک صوفی شاہ سلیمان صاحب کے خاص مریدوں
میں تھے جب اپنے پیر کے پاس سے کشف و کرامت حاصل کر کے دہلی آئے تو یہاں
بہت مشہور ہو گئے۔ پہلے مرزا سلیم بہادر کے بڑے بیٹے مرزا زمان شاہ کی
بیوی کو مرید کیا اور کچھ دن بعد ان کے ساتھ نکاح کر لیا اس دن سے ان کے
مریدان سے پھر گئے لیکن پیر صاحب نے رفتہ رفتہ بادشاہ کو اپنا معتقد بنا
لیا بادشاہ اس درجہ اپنے بھولے پن سے ان کے معتقد ہو گئے کہ روزانہ صبح
کو یہ اپنا لباس دہن بادشاہ کے منہ میں لگاتے تھے۔ غدر کے ہنگام میں نجف خان
جزیل ان کی خدمت میں حاضر ہوئے تو انھوں نے دو کھیل اور ایک تلوار بطور تبرک
نجف خان کو دی اور ایک خط بھی کسی امیر کے نام فوج کی فراہمی کے لیے لکھا تھا اس
جرم میں پندرہ شوال ۱۳۷۷ھ کو ہفتہ کے دن ان کو پھانسی دے دی گئی۔

(۳۰) غلام محمد خان نواب احمد علی خان رئیس فرخ نگر کے چچا اپنے بڑے بھائی نواب مظفر خان کی گدی نشینی کے زمانہ میں نائب تھے۔ جب نواب مظفر علی خان کا انتقال ہو گیا تو ان کے بیٹے یعقوب علی خان اپنے باپ کی جگہ گدی پر بیٹھے غلام محمد صاحب سے اور یعقوب علی خان سے تکرار ہو گئی بات یہاں تک بڑھی کہ گورنری اور ایجنسی سے یعقوب علی خان کے ایما سے ان کو وہی قیام کرنے کا حکم ملا اور تیرہ سو روپے سال ریاست سے ان کا وظیفہ مقرر ہو گیا۔ چند سال کے بعد یعقوب علی خان کا دنیل کے مرض میں انتقال ہو گیا۔ ان کے بعد احمد علی خان ان کے چھوٹے بھائی ان کی جگہ گدی پر بیٹھے ان سے ان کی رنجش رہی لیکن غدر کے زمانہ میں غلام محمد صاحب اہل و عیال سمیت احمد علی خان کی رضامندی سے فرخ نگر چلے گئے۔ ایک مرتبہ احمد علی خان کی طرف سے کچھ روپیہ لے کر بادشاہ کی خدمت میں وہی آئے تھے اس کے بعد پھر فرخ نگر لوٹ گئے۔ جب وہی پرانگیزیوں کا قبضہ ہو گیا تو اس اکتوبر کو احمد علی خان رئیس فرخ نگر کو اس جرم میں گرفتار کیا گیا کہ وہ پہاڑی پر نہیں آئے تھے اور بادشاہ کے ساتھ ساز باز رکھتے تھے۔ ان سب علاقہ ضبط کر لیا گیا تھوڑے دن بعد ان کو بھی پھانسی دے دی۔ غلام محمد خان اس دن سے بھاگے رہے لیکن ستمبر ۱۸۵۷ء میں ڈونلڈ سے گرفتار کر کے لائے گئے اور کوٹوالی میں قید کر دیئے گئے۔

(۳۱) نواب عبدالرحمن خان رئیس مجھڑ کے چچا نواب علی محمد خان ان کے والد کا نام نواب فیض محمد خان تھا نواب عبدالرحمن خان بہت قابل لوگوں میں تھے انگریزی عربی فارسی میں پوری مہارت رکھتے تھے مجھڑ میں ہمیشہ پرانی چھاؤنی میں رہتے تھے ان کو خفقان کا عارضہ تھا علاج کے لئے کبھی کبھی دہلی آ کر رہتے تھے۔

انہوں نے ایام غد میں بادشاہ یا فوج سے کچھ واسطہ نہ رکھا لیکن نواب عبدالرحمن خاں کی گرفتاری کے دن یہ پیارے بھی روپوش ہو گئے پھر ان کا پتہ نہیں ملا کہ کہاں چلے گئے۔ (۴۲) راجہ اجیت سنگھ - راجہ نذر سنگھ دالی پٹیلہ کے چچا تھے۔ یہ پچیس سال سے دہلی ہی میں رہتے تھے۔ باغیوں نے یہ سمجھ کر کہ یہ راجہ پٹیلہ کے چچا ہیں ضرور انگریزوں سے ساز باز رکھتے ہوں گے۔ ان کا سب مال اسباب لوٹ لیا اور ان کو گرفتار کر کے قتل کرنے کے واسطے بادشاہ کے سامنے لے گئے۔ بادشاہ نے ان کی بے جرمی اور عالی خاندانی کا خیال کر کے باغیوں کے ہاتھ سے بچا لیا اور دیوان خاص میں رہنے کو جگہ دے دی۔ جب باغی بھاگے اور انگریزوں کا تسلط ہو گیا تو یہ غازی آباد چلے گئے۔ کچھ روز بعد انگریزوں کی اجازت سے دہلی چلے آئے۔ اور پھر یہاں سے اپنے وطن پٹیلہ کو چلے گئے۔

(۴۳) مولوی محمد نذیر حسین صاحب اور مولوی عبدالرشید صاحب اور مولوی حفیظ اللہ خاں صاحب نے غد میں ایک دو میموں اور بچوں کو اپنے گھر میں پھپھایا تھا اس صلہ میں ان کو انگریزوں نے انعام دیا اور ان کی غیر خواہی کی قدر کی۔ (۴۴) مرزا اسد اللہ خاں غالب عرف مرزا نوشہ صاحب کے گھر میں جند گورے گھس کر ان کو گرفتار کر کے لے گئے اور کرنیل برن صاحب کے سامنے لے جا کر ان کو پیش کیا۔ مرزا صاحب کی کچھ زندگی ابھی باقی تھی۔ ان کے ایک دوست اتفاق سے اس وقت وہاں بیٹھے ہوئے تھے۔ انہوں نے ان کی سفارش کر کے رہائی دلا دی ان کا کہنتی بہادر سے ساٹھ روپے ہینہ بطور نیشن مقرر رہے لیکن اس میں ان کی گزربدقت ہوتی ہے۔ ہمیشہ تنگدست رہتے ہیں۔

(۴۵) نواب علی بخش خان کے بڑے لڑکے غلام فخر الدین خان انگریزی عمارت میں کوٹ قاسم کے تحصیلدار تھے۔ اشرف خان اور حیدر شاہ خان خبروں کے

ساتھ جھے پور اور الور سے، اسی ۱۸۵۷ء کو کشر دہلی کے حکم سے دوشنبہ کے دن
 الور کی فوج کی حراست میں دہلی لائے گئے۔ اور کو تو الی میں اور قیدیوں کے
 ساتھ ان کو بند کر دیا گیا۔ حیدر شاہ خاں اور اشرف خاں نے صرف خیر خواہی کے
 لئے ایک سو سات نوجوانوں کو الور سے گرفتار کر کر دہلی بھیجا تھا جن میں سے آدھے
 لوگ تو گورگانوں میں قتل کر دیئے گئے اور باقیوں کو دہلی میں پھانسی ہوئی۔
 انہوں نے سینکڑوں بے گناہوں کا خون اپنی گردن پر لیا ہے۔ غلام محمد خضر الدین
 خاں صاحب تو ۱۱ اگست ۱۸۵۷ء کو رہا ہو گئے، درجھوٹے خبر دو نو مجرم قرار پائے۔
 آخر خیر ضمانت دے کر چھوٹے۔

بعض اشخاص کے نئے حالات

— ۱۸۵۷ء —

اس کتاب میں جن اشخاص کا ذکر آیا ہے ان میں سے بعض اشخاص کی پوری
 حقیقت معلوم کرنے کے لئے میں نے چھ سات مہینے اس کتاب کی اشاعت کو روکے
 رکھا۔ حالانکہ کتاب کی کاپیاں چھاپہ خانہ میں جا کر چھپ بھی گئی تھیں۔

بہت تلاش و جستجو کے بعد جب مجھے کامیابی نہ ہوئی تو ایک نواب مصلح الدین
 صاحب ملاقات ہوئی جو نواب مسعود جنگ بہادر دہلی سید اس مسعود صاحب بنیر آریل سر سید احمد
 خان بہادر مرحوم کے حقیقی ناموں میں احمد ہیں اس اشخاص کو رکھا ذکر کیا۔ کیونکہ نواب مصلح
 الدین صاحب دہلی میں ایک زندہ تاریخ ہیں۔ ان کو دہلی اور اہل دہلی کے حالات
 ایسی تفصیل سے معلوم ہیں کہ غالباً ان کے سوا اور کسی کو معلوم نہ ہوں گے۔ اور میں نے

ہمیشہ معلومات کی مشکل کے وقت ان ہی سے مدد لی ہے۔

انہوں نے اس کتاب کے اشخاص کی پوری اور مسترح حقیقت بیان کر دی مگر اس حقیقت میں بعض باتیں ایسی بھی تھیں جنکو نہ نواب صاحب شائع کرنے کے قابل تصور کرتے تھے نہ بیان کی اشاعت مناسب سمجھتا تھا۔ اس لئے میں نے ان تمام حالات کا خلاصہ کر دیا تاکہ ناظرین کے لئے ضروری معلومات مہیا ہو جائے اور کسی کو اپنے بزرگوں کے ناقابل اظہار حالات کی اشاعت سے رنج بھی نہ ہونے پائے۔

یہ حالات اگرچہ مختصر ہیں لیکن موجودہ اور آئندہ نسل کے لوگوں کو ان سے چند چیزیں بالکل نئی معلوم ہو جائیں گی۔ ”حسن نظامی“

منشی موہن لال آغا حسن جان صاحب منشی موہن لال صاحب عرف آغا حسن جان کے حالات معلوم کرنے کا مجھے بہت خیال تھا۔ میں نے کئی دوستوں کو لکھا مگر کسی نے جواب نہ دیا۔ آخر نواب مصلح الدین صاحب سے اُن کی حقیقت معلوم ہوئی۔

منشی موہن لال عرف آغا حسن جان کا کتاب میں کئی جگہ ذکر آیا ہے۔ وہ ذات کے برہمن تھے اور غالباً کشمیری برہمن ہونگے کیونکہ اُن کی موجودہ اولاد بہت خوبصورت ہے۔ ان کے صاحبزادہ صاحب بھی زندہ ہیں جو اب درویش ہو گئے ہیں اور اُن کے پوتے سے میری بہت دوستی ہے اور وہ اردو زبان کے خاص ادیبوں میں ہیں۔

نواب مصلح الدین صاحب نے فرمایا منشی موہن لال مسلمان ہو گئے تھے۔ اُن کا نام آغا حسن جان رکھا گیا اور وہ انگریزی گورنمنٹ کی ملازمت میں شریک کر کا بل گئے اور نہایت عہدگی کے ساتھ سرکاری خدمات انجام دیں۔ امیروست محمد شاہ کابل کی گرفتاری بھی انہی کے دور ملازمت میں ہوئی تھی۔ آغا حسن جان صاحب کی صاحبزادی کا عقد خان بہادر ڈیپٹی اکرام اللہ خان مرحوم سے ہوا تھا جو دہلی کے مشہور رئیس تھے اور سر کی والوں کے محلہ میں رہتے تھے۔

محبوب علی خاں صاحب۔ بہادر شاہ بادشاہ کے وزیر بھی ہو گئے تھے۔ بہت دولت مند تھے۔ یہ وہی کالین دین بھی کرتے تھے۔ ایک دفعہ بہادر شاہ درگاہ حضرت خواجہ نظام الدین اولیاء میں لے کر گیا۔ محبوب علی خاں بھی ساتھ تھے۔ سیر پرانا میر غلام حسین صاحب بہادر شاہ کی بہت بے تکلفانہ باتیں ہوا کرتی تھیں۔ انہوں نے بہادر شاہ سے کہا: میاں سراج الدین، بہادر شاہ کا نام تھا، تم کو معلوم ہے کہ مغلیہ سلطنت میں ڈال کیوں آیا؟۔ بہادر شاہ بولنے لگے کہ تم تھے۔ انہوں نے اشارے سے ہوں کر کے پوچھا۔ بتا دیا۔ سبب یہ ہے کہ زمانے کا جب تھا کہ وزیر سود خوار بننے ہونے لگے تو سلطنت کا اللہ بلی ہے۔ بہادر شاہ یہ فقرہ سن کر مسکرانے لگے اور انہوں نے مگر محبوب علی خاں کو دیکھا۔ محبوب علی خاں ہاتھ جوڑ کر عرض کی: حضور امیری خطا یہ ہے کہ اس گاہ کے نام پانچ روز مقرر تھے۔ وہ بعض حالات کے سبب بند کر دیے گئے ہیں اور پیر زادہ صاحب اسکی وجہ سے مجھ سے ناراض ہیں۔ بادشاہ نے کہا یہی اماں دیہ بادشاہ کا نگینہ کلام تھا، یونہی جاری کر دو۔ یہ بُری بات ہے۔ کہ درگاہوں کا خرچ بند کیا جائے۔

محبوب علی خاں صاحب کی اولاد میں اب بھی ایک صاحب تارا چند کے کوچہ میں رہتے ہیں اور نقشہ نویسی کا کام کرتے ہیں۔ مدرسہ دارالہقا۔ یہ مدرسہ جامع مسجد کے جنوبی گوشہ میں تھا جہاں آجکل سنگھارا بنا ہوا ہے۔ اور اس میں ایک کنواں بھی ہے اور جس کے قریب سڑک کے پاس کباڑیوں کی دکانیں اور حکیم نابینا صاحب کا مطب ہے۔

یہ مدرسہ بہت مشہور اور بہت آباد تھا۔ دور دور سے طلباء یہاں پڑھنے آتے تھے اور رات دن اہل علم کا یہاں ہجوم رہتا تھا۔

ملا نظام الملک صاحب۔ ان کا عرف شاہ جی تھا۔ دہلی میں شاہ جی کا تالاب شاہ جی کا چھتہ انہی کے نام سے اب تک مشہور ہے۔ یہ مرہٹوں کے صوبہ دار اور بہت لائق اور منتظم عہدہ دار تھے۔ چٹاؤڑی بازار میں چٹاؤڑی مرہٹی میں کو تالی کو کہتے ہیں۔ مرہٹہ گردی میں یہاں مرہٹوں کی

کو تو الٹی تھی اور اب بن ناریس طبع انغبیر آباد ہیں۔ دہلی کے ایک شاعر مولانا راسخ نے لکھا ہے کہ
چا وڑی قاف سے یا خلد بریں، راسخ جگمگے جوڑوں کے بریوں کے برے رہتے ہیں
نواب غلام محی الدین خان عرف بدھن صاحب۔ انکے والد نواب لمیخاں تھے۔ اور دادا لالا
نظام الدین صاحب عرف شاہجی تھے جن کا تذکرہ اوپر کیا ہے۔

میاں نظام الدین صاحب۔ یہ حضرت ملا نظام الدین اورنگ آبادی کی اولاد ہیں
تھے حضرت ملا نظام الدین کا کوری ضلع لکھنؤ کے شیوخ میں تھے۔ بڑے عالم اور بڑے درویش
تھے۔ اورنگ آباد کنہیل کا فرار ہے اور حضور نظام کی طرف سے چالیس ہزار روپے سالانہ کی جاگیر بھی اس
درگاہ کے لئے وقف ہے۔ انکو حضرت خواجہ نظام الدین اورنگ آبادی کے نام سے یاد کیا جاتا ہے
ان کے فرزند حضرت مولانا فخر الدین دہلوی تھے جنہوں نے آخر زمانہ میں سلسلہ چشتیہ
نظامیہ کو بہت فروغ دیا حضرت مولانا نیاز بریلوی اور حضرت مولانا نور محمد مہاروی انہی
کے خلفاء میں تھے حضرت مولانا فخر صاحب کے صاحبزادہ میاں قطب الدین صاحب ہوئے۔
انکے فرزند میاں نصیر الدین کئے صاحب ہوئے۔ اور انکے فرزند میاں نظام الدین صاحب ہوئے۔
اورنگ آباد اور حیدر آباد میں بھی اس خاندان کے لوگ موجود ہیں اور دہلی میں بھی کوچہ پنڈت
میں پیر جی میاں عبدالصمد صاحب اسی خاندان سے تعلق رکھتے ہیں۔

لالہ جہتال صاحب۔ انکی اولاد میں لالہ بادھے موہن صاحب گدڑی پر ہیں۔ یکھتری ہیں اور بڑے
صاحب زادہ ہیں۔ انکی کوٹھی کا نام جہتال سالک رام ہے۔ یہ خاندان چاندنی چوک کٹرہ نیل میں
آباد ہے۔

نواب اکبر خاں۔ یہ نواب امیر خاں کے فوجی سرداروں میں تھے۔ نواب امیر خاں ٹونک کی
ریاست حاصل کی تھی جو اپنے زمانہ میں بہت مشہور تھے اور انکے خاص آدمیوں میں تھے۔
میر محمد حسین صاحب عرف میر خیراتی۔ انکی زینہ اولاد نہیں ہی۔ لڑکی کی اولاد پنڈت کے
کوچہ میں موجود ہے۔ مودودی خاندان کے اکثر افراد اسی نسب سے تعلق رکھتے ہیں۔

مرزا فاضل بیگ صاحب۔ انبیاء کی گلی کوچہ چیلان میں رہتے تھے۔ ان کے خاندان میں میرزا بیگ صاحب پیدل سرشتہ تعلیم لاہور میں بھی ملازم تھے۔ ان کے اجداد کے مزارات ہمارے ہائی درگاہ میں ہیں۔

حکیم عبدالحق صاحب۔ انکی جوہلی دہلی دروازہ کے قریب تھی جس پر آج کل کٹروہ پانی والا لکھا ہوا ہے اور جو خان بہادر صاحبی محمد یوسف پانی والوں کے قبضہ میں ہے۔ قاضی فیض اللہ صاحب کشمیری۔ حمید منزل دریا گنج میں ایک مشہور جوہلی ہے وہ انہی کی ملکیت میں تھی۔ غدر میں باغیوں نے عیسائیوں کو گرفتار کر لیا تھا۔ ان عیسائیوں میں ان کے بھی کچھ دوست تھے۔ انکو رہا کرانے کی مصلحت سے شاہی کوتوالی میں نوکر ہو گئے تھے۔ انگریزوں کا تسلط ہوا تو شبہ میں ان کو بھی پھانسی دے دی گئی۔

منشی آغا جان صاحب۔ مفتی صدر الدین صاحب کو ان کی بہن بیابہ ہوئی تھیں۔ نواب کرم اللہ خاں صاحب عرف ننھے خاں صاحب مرحوم انہی کے صاحبزادہ تھے۔ جن کے مکانات بٹیا محل میں ہیں۔

مفتی صدر الدین خاں صاحب۔ آکا عنایت الرحمن خاں صاحب اور آکا احسان الرحمن خاں صاحب مفتی صاحب کے بھائی تھے۔ کوئی اولاد مفتی صاحب کے نہ تھی۔ ان کے بھائیوں کی اولاد اب بھی دہلی میں موجود ہے۔ نواب ابوالحسن خاں صاحب آئی۔ اے فرسٹ کلاس مجسٹریٹ دہلی مفتی صاحب کے بھائی کی اولاد ہیں۔

مفتی صاحب کے والد نواب عبدالرحمن خاں صاحب لارڈ لیک کو مرہٹوں کے مقابلہ کے لئے لائے تھے اور تارنچ دہلی میں ان کا ایک خاص حصہ ہے۔

حافظ داؤد صاحب۔ دہلی کے چاؤڑی بازار میں ان کے نام کا کمرہ اب تک موجود ہے۔ جو نواب صاحب دوجانہ کے قبضہ میں ہے۔ درگاہ قطب صاحب میں ان کی باؤلی بھی مشہور ہے۔

نواب سید حامد علی خاں صاحب - ان کا خاندان کشمیری دروازہ دہلی میں آباد ہے۔ دہلی کا مشہور عربک کالج انہی کی امداد سے چل رہا ہے۔ انہوں نے ایک لاکھ ستر ہزار روپے مسلمانوں کی تعلیم کے لئے وقف کئے تھے۔ یہ آغا میر وزیر شاہ اودھ کی مغرولی کے بعد شاہ اودھ کے وزیر ہو گئے تھے۔

میرزا معین الدین حسن خاں - نواب قدرت اللہ بیگ خاں کے بڑے بیٹے تھے۔ عذر کے بعد حیدر آباد چلے گئے تھے اور نواب سرسار جنگ مرحوم نے ان کو نوکر رکھ لیا تھا۔ یہ نواب احمد سعید خاں صاحب رئیس خاندان لوہارو کے ماموں تھے اور کہا جاتا ہے کہ سرکاری مخبری کا الزام بھی ان پر تھا۔
لالہ رام جی داس صاحب - ان کے خاندان میں رائے بہادر لالہ سری کرشن داس صاحب اب بھی دہلی میں موجود ہیں۔

موسے خاں صاحب - ان کے بیٹے کا نام احمد حسین خاں تھا۔ نواب کلب علی خاں صاحب رئیس رام پور نے تیس روپے ماہوار ان کی گزراوقات کے لئے مقرر کر دئے تھے۔

نواب نبی بخش خاں صاحب - دہلی دریاہ کلاں میں ان کی مسجد اب بھی موجود ہے۔ اور ان کی اولاد کے پاس معقول جائیداد بھی ہے۔

محمد علی خاں صاحب - ان کی حویلی اب بھی کوچہ چیلان میں موجود ہے اور آج کل اس حویلی میں چمار آباد ہیں۔

حکیم امام الدین خاں صاحب - آج کل ان کا خاندان حکیم بقا والا کہلاتا ہے اور چاؤاڑی کے قریب حکیم بقا والوں کی گلی مشہور ہے یہ لوگ آنکھوں کا علاج کرتے ہیں۔
میاں حسن عسکری صاحب - چشتیہ نظامیہ سلسلہ کے بزرگ تھے۔ ان کے سگے بھانجے شاہ امیر حسین صاحب صابری تھے۔ جن کی خانقاہ دریا گنج میں اب

بھی موجود ہے۔ جس کے موجودہ سجادہ نشین شاہ کراچین صاحب ہیں۔
 بیرم خاں کے تلامذہ میں شاہ صاحب کی ایک بہت بڑی جوہلی تھی جو آج کل
 رائے بہادر لالہ سلطان سنگھ صاحب آنجنابی کے پیٹے کے قبضہ میں ہے۔
 نواب غلام فخر الدین خاں صاحب۔ انکے صاحبزادہ نواب احمد سعید خاں
 ہوئے اور ان کے فرزند نواب نصر الدین خاں صاحب جو آج کل حیدر آباد دکن میں حضور
 نظام کے خزانہ کے صدر محاسب ہیں۔ نواب غلام فخر الدین خاں صاحب کا فرار درگاہ
 حضرت خواجہ نظام الدین اولیاء رحمہ میں میرے مکان کے قریب ہے۔ اور بچپن میں
 میں ان کے پاس ہمیشہ کھیلا کرتا تھا کیونکہ آخر عمر میں یہ ترک وطن کر کے اس مکان میں
 آگئے تھے جہاں ان کا گھر ہے اور رات دن عبادتِ حق میں مصروف رہتے تھے۔
 بڑی نورانی صورت تھی۔

نواب خواجہ صالح الدین خاں صاحب۔ جن سے یہ تمام واقعات معلوم ہوئے
 ان کا تذکرہ بھی اس کتاب میں لکھنا چاہتا ہوں۔ ان کا نام نواب خواجہ
 صالح الدین خاں ہے۔ ان کے والد کا نام نواب خواجہ شرف الدین خاں صاحب
 تھا۔ اور ان کے والد نواب خواجہ زین العابدین خاں صاحب تھے۔ یہ خاندان
 ۲۹ واسطہ سے حضرت خواجہ یوسف ہمدانی رحمہ سے مل جاتا ہے۔ انکے والد
 کے دادا نواب خواجہ فرید الدین احمد خاں صاحب اکبر شاہ ثانی کے وزیر
 تھے۔ اور سردار احمد خاں صاحب اس خاندان کے نواسہ تھے +

بِسْمِ خُتْمِ "حَسَنِ نِظَامِی"

دہلی

۲۴ دسمبر ۱۹۳۰ء

تاریخ غنہ دہلی پہلے گیارہ حصے

پڑھنے ضرور ہیں۔ نہ پڑھے ہوں تو ان کے نام سن لیجیے اور ان کو فوراً خرید فرمائیے :-

۸	قیمت	بگیاٹ کے آسنو	پہلا حصہ
۸	"	انگریزوں کی بیٹیا	دوسرا حصہ
۴	"	محاصرہ دہلی کے خطوط	تیسرا حصہ
۶	"	بہادر شاہ کا مقدمہ	چوتھا حصہ
۴	"	گرفتار شدہ خطوط	پانچواں حصہ
۳	"	دہلی کے اخبار	چھٹا حصہ
۱۲	"	غالب کا روزنامہ غدر	ساتواں حصہ
۷	"	دہلی کی جاں کنی	اٹھواں حصہ
۷	"	غدر کی صبح شام	نواں حصہ
۷	"	دہلی کا آخری سانس	دسواں حصہ
۷	"	دہلی کی آخری شمع	گیارہواں حصہ

کارکن حلقہ مشائخ بکڈپو۔ دہلی سے منگائیے

ہیگمات کے آنسو

قدر دان کے دامن میں

تاریخ غدر دہلی کے پہلے حصہ کا نام ”ہیگمات کے آنسو“ رکھا گیا تھا۔ وہ ایسی مؤثر زبان میں ہے اور اس کے واقعات اس قدر دردناک ہیں کہ کوئی پڑھتے والا آنسو بہائے بغیر ان کو نہیں پڑھ سکتا۔

آنریبل سر سید احمد خاں بہادر مرحوم کے پوتے جناب نواب مسعود جنگ بہادر یعنی سید اس مسعود صاحب نے خاص فرمائش کے ساتھ اس کتاب کا ایک اعلیٰ ایڈیشن طبع کرایا ہے جو آرٹ پیپر پر چھپا ہے اور اس کی جلد بھی عمدہ بنوائی گئی ہے۔

یہ ایڈیشن لائبریریوں میں رکھنے کے قابل ہے

اس میں چند خاص اور جدید افسانے بھی بڑھائے گئے ہیں جو معمولی ایڈیشن میں نہیں ہیں۔

یا وجود اتنی خوبیوں کے!

قیمت صرف تین روپے

مقرر کی گئی ہے

ملنے کا پتہ :- کارکن حلقہ مشائخ بکڈ پو دہلی

